جملہ حقوق محفوظ

جلد (۱۰) - اکتوبر سنہ ۱۹۰۵ء نمبر (۱)

ایڈیٹر
شیخ عبد القادر بی۔ اے

مخزن

مضامینِ اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

مضامینِ نثر

اُپنشد - شمس العلما سید علی بلگرامی صاحب (از کیمبرج) ۱
جرمن طالب علم کی زندگی - ریورینڈ ڈاکٹر وائٹ بریخٹ - ۸
گلبازی یا گلباری - شیخ عبد القادر از فرانس ۱۲
اطالیہ - لالہ لاجپت رائے (از انگلستان) ۲۳
فن شاعری - مرزا سلطان احمد اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ۳۱
یتیم - قاری محمد سرفراز حسین عزمی (دہلوی) ۴۱
ایک سیب کا معاوضہ - منشی نیاز احمد از میرٹھ ۴۵

مضامینِ نظم

التجائے مسافر - شیخ محمد اقبال ایم۔ اے۔ ۴۹
شاعری - نادر علیخاں نادر۔ کاکوروی - ۵۳
بلبل کو انگلستان - منشی درگا سہائے سرور - جہان آبادی ۵۵
سرود رفتہ - منشی دوارکا پرشاد افق ۵۷
ترجمہ اینک گارڈن - سید ضامن کنتوری ۵۸

کتب خانہ انجمن ترقی اردو

نقشہ ہندوستانی اردو ... ستانی

○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے ۔ □ ان شہروں میں اردو مروج ہے ۔ (+) ان شہروں میں اردو سمجھتے ہیں ۔

شیخ محمد اکرام اسسٹنٹ ایڈیٹر
نے خادم التعلیم سٹیم پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

۳۳۳

سونے کا انڈا دینے والی مُرغی

موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دو

ہمارے پاس ایک مُرغی ہی۔ جو تمہارے گھر جاکر ہر روز ایک سونے کا انڈا دیگی۔ یہ تمہارے گھر آنا چاہتی ہی۔ لیکن یاد رکھو۔ اگر تم غفلت کروگے۔ تو یقیناً تمہارے گھر کی بجائے یہ تمہارے ہمسایہ کے گھر چلی جائیگی۔ اور وہاں جاکر سونیکا انڈا دیگی۔ یہ موقعہ ہاتھ سے جانے نہ دو۔ اس موقعہ سے مراد

بیس بیماریوں کی ایک دوا ہی

یہ دوائی مفصلہ ذیل بیماریوں کا شرطیہ علاج ہی:-

گنٹھیا (۲) ہیضہ (۳) دست (۴) پیچش (۵) کھانسی (۶) زکام (۷) جگر کی بیماریاں (۸) قولنج (۹) بادسول (۱۰) وجع العصب (۱۱) دمہ (۱۲) سرخ باد (۱۳) دائمی بدہضمی (۱۴) سردی (۱۵) سوزش حلق (۱۶) نزلہ (۱۷) خسرہ (۱۸) درد دنداں (۱۹) تشنج (۲۰) درد سر (۲۱) زخم (۲۲) موچ (۲۳) بخار (۲۴) چھاجن (۲۴) گلے کی بیماری (۲۵) موسمی بخار (۲۶) گرانی شکم (۲۷) پشت کا درد (۲۸) موسمی دانے پھنسیاں (۲۹) باری کا بخار (۳۰) کالی کھانسی (۳۱) درد کمر (۳۲) نقرس (۳۳) چوتھیہ کا بخار (۳۴) بچھو (۳۵) بھڑ (۳۶) شہد کی مکھی (۳۷) کن کھجورا (۳۸) سانپ اور ہر قسم کے زہریلے کیڑوں اور جانوروں کے ڈنگ اور زخم (۳۹) سوزش بول (۴۰) چوٹ چپیٹ (۴۱) درد پسلی (۴۲) اندرونی درد (۴۳) درد معدہ (۴۴) پیٹ درد (۴۵) ہاتھ پاؤں کا پھوٹنا۔ یہ اندرونی و بیرونی دونو طرح پر استعمال کیجاتی ہی۔ جو شخص اس عجیب و غریب دوائی کو ہر قسم کے درد یا بیماری میں استعمال کرنے کے لئے ہمیشہ گھر میں موجود رکھتا ہی وہ سینکڑوں روپیہ بچا لیتا ہی۔ جو کہ اسکو دوسری حالتیں ڈاکٹر و حکیم کے نذر کرنے پڑتے۔ قیمت عـہ

ہر قسم درد کا علاج

یہ دوائی ہر قسم کے درد کو خواہ سر میں یا دانت میں ہو یا جسم کے کسی اور حصہ میں ہو صرف بیرونی طور پر لگانے سے فوراً رفع کرتی ہی۔ یہ ایسی موثر دوائی ہی کہ جو درد کہ دوائی کے لگانے سے رفع نہ ہو دنیا کی کوئی دوائی اسے اچھا نہ کر سکیگی صرف درد کبھی اچھا ہو جاتا ہی (عـہ)

زکام کا علاج

یہ زکام - سر درد - آدھے سر کا درد - وجع العصب کا نہایت عجیب فی علاج ہی۔ صرف سونگھنے سے یہ فوراً اور یقینی طور پر اپنا اثر پیدا کرتی ہی اور مستقل طور پر مریض کو شفا دیتا ہی۔ قیمت ایک روپیہ (عـہ)

مدن گوپال اینڈ کمپنی لاہور

جلد ۱۰ - نمبر ۱

مخزن

اُپنشد

ہندو فلسفہ اور تصوّف کا مجمُوعہ

اُپنشدوں کی عبارت نہایت دقیق ہے اور ان پر بے اِنتہا شرحیں سنسکرت زبان میں لکھی گئی ہیں - اور ان میں سے بعض کے ترجمے یورپ کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں - اس میں شک نہیں - کہ یورپین دماغ کے لئے اِن کی اصلی تہ کو پہنچنا نہایت دشوار ہے - اور اِس وجہ سے یُورپی ترجمے اکثر ناقص ہیں - لیکن ان ترجموں سے اس قدر فائدہ البتّہ ہوتا ہے - کہ یورپین عُلما کا طرزِ خیال اور مشرقی مسائل پر نظر ڈالنے اور نتائج نکالنے کا طریقہ معلوم ہو جاتا ہے - جہاں تک ہمیں معلوم ہے - اس وقت تک اُردو میں کوئی ترجمہ اُپنشد کا شائع نہیں ہوا ہے - گو اِسکی سخت ضرورت ہے - ہم اپنے ترجمے میں اوّلاً شنکر اچاریا کی شرح اور انند گیری کے حاشیئے کو جو اس نے اِس شرح پر لکھا ہے ملحوظ رکھینگے اور اس کے سوا جو کچھ یورپ کے مصنفین نے اُپنشدوں کی نسبت خیالات ظاہر کئے ہیں اور جو کچھ توجیہیں اُنہوں نے مختلف مقامات کی کی ہیں - اُن سے بھی کام لینگے -

دس اُپنشدوں کا مجموعہ میں جو بمبئی اور کلکتے میں چھپا ہے۔ سب سے پہلا اُپنشد ایشو پنشد ہے۔ اور اسی کے ترجمے سے ہم ابتدا کرتے ہیں۔ یہ اُپنشد شُکل یجر وید سے متعلق ہے اور شت پتھ برہمنہ[ط] کے آخر میں واقع ہوا ہے۔ اور نظم میں ہے۔ جدید تحقیقات سے یہ ثابت ہوا ہے۔ کہ جن اُپنشدوں کی عبارت نثر ہے۔ وہ بمقابل نظم اُپنشدوں کے زیادہ قدیم ہیں

ایشو پنشد ایک لحاظ سے خاص دلچسپی رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ ایسے وید سے متعلق ہے۔ جس میں نرے اعمال بھرے ہوئے ہیں۔ اور نجات کا دارومدار انہی اعمال کے درست طور پر انجام دینے میں قرار دیا گیا ہے۔ برخلاف اس کے اُپنشد اور ویدانت کی تعلیم یہ ہے کہ نجات کا دارومدار محض وِدّیا یعنی اصلی علم پر ہے۔ جس وقت انسان دُنیا کے ظاہری محسوسات سے پار ہو کر ان محسوسات کی جو جڑ ہے۔ اُس تک پہنچ جاتا ہے۔ تب اُس کو مُکتی مِل جاتی ہے۔ پس گویا اس اُپنشد کی تعلیم میں اور اُس خاص وید کی تعلیم میں جس کا یہ ضمیمہ ہے۔ ایک قسم کا تبائن واقع ہوا ہے۔

ایشو پنشد

ا۔ تمام دُنیا یعنے جو کچھ اس زمین پر ہے اور اس کے ساتھ حرکت کرتا ہے۔ صرف ایشا (خدائے مطلق) کا ظہور ہے۔ وہ ان سب پر حاوی ہے اور سب کو ڈھانکے ہوئے ہے۔ پس اس دنیا کو چھوڑ کر اصلِ حقیقت کو پا اور سچا تمتّع حاصل کر۔ اے شخص! کسی کی دولت پر نظر نہ ڈال

۲۔ اگر کوئی سو برس تک جینے کی تمنا رکھے۔ تو اس کو چاہیئے کہ کریا کرم (اعمال) اور عبادت کرتا جائے۔ یہی راستہ ہے۔ کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ جس سے انسان کو بُرے کام چمٹ نہ جائیں

[ط] شت پتھ کے لفظی معنے صد باب ہیں ۱۲

یہ اشارہ اُن لوگوں کی طرف ہے - جو دنیا کو ترک کر کے اور صرف آتمن پر دھیان دیکر نجات حاصل کرنا نہیں چاہتے - بلکہ دُنیا میں رہنا چاہتے ہیں - پس اِن کے لئے - یہی راستہ بتایا گیا ہے - کہ نیک کام کریں اور برسوں دنیا میں جئیں - اس قسم کے اعمال اُن کو بار بار جنم لینے اور سنسار کے چکر سے بچا ئینگے -

۳ - جو اشخاص آتمن کو مارتے ہیں - یعنی آتمن کے علم پر جہالت کا پردہ ڈالتے ہیں - وہ اس جنم سے نکلنے کے بعد ایسے جنموں میں جا پہنچیں گے - جو اُسروں کے جنم ہیں اور جو گہری تاریکی میں ڈوبے ہُوتے ہیں -

۴ - وُہ آتمن ایک ہے - لاثانی اور مستقیم بلا حرکت ہے - اور اس کے ساتھ ہی انسان کے ذہن سے بھی زیادہ تیز ہے - اِنسان کے حواس اس کو پا نہیں سکتے - وُہ اُن سے آگے آگے جاتا ہے - باوجود ایک مقام پر مستقیم ہونے کے وُہ اُن سے زیادہ تیز ہے جو اُس کے پیچھے دَوڑ رہے ہیں - اِسی کی بدولت ہوائے لطیف تمام عالم کی رُوح اور تمام جانداروں کے افعال و حرکات کو قائم رکھے ہُوئے ہیں -

اِس فقرے میں آتمن کی حالت بیان کی گئی ہے - اس کے مستقیم ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا اور اس کی تیزی سے یہ مراد ہے کہ جس قدر دوڑ تک اِنسان اپنے خیال اور ذہن کو جولان دے - اُس کا منتہیٰ آتمن ہے - گویا آتمن اُس کے خیال سے بھی پہلے وہاں جا کر موجود ہو گیا -

۵ - وُہ حرکت میں آتا ہے - اور بے حرکت ہے - وُہ دور ہے - اور پھر نزدیک ہے - وُہ اس تمام عالم کے اندر ہے اور پھر تمام عالم سے باہر ہے -

۶ - جو کوئی تمام عالم کو اپنے ہی آتمن میں پاتا ہے - اور اپنے آتمن کو تمام عالم میں پاتا ہے - اُسکو کوئی امر نفرت انگیز نہیں معلوم ہوتا -

چونکہ ایسا شخص اصل حقیقت کو پا گیا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اُسے کسی ایسی چیز کا سامنا نہیں ہوتا۔ جو نفرت دلائے۔

۷۔ جب کہ عارف کی نظروں میں تمام عالم خود اس کی اتمن میں سما جاتا ہے۔ پھر اُسے کس امر کی پریشانی اور کس امر کا رنج۔ وُہ تو وحدتِ وجُود کو پا گیا ہے۔

۸۔ یہ اتمن نورانی ہے اور بے جسم۔ حِس سے بری۔ خالص اور پاک۔ بصیر اور علیم۔ جبار اور قوی۔ ہر چیز پر محیط ہے۔ اور ہر ایک کو اُس نے اپنا اپنا فرض دوام کے لئے تقسیم کر دیا ہے۔

۹۔ جو اَودیا (مراد کریا کرم) کو مانتے ہیں۔ وُہ گہری تاریکی میں ہیں۔ لیکن وُہ جو وِدیا (مراد دیوتاؤں) کی پرستش کرتے ہیں وہ اس سے بھی زیادہ تاریکی میں ہیں (یہ شنکراچاریا کی شرح کے مطابق ترجمہ ہے لیکن اس کی نسبت آخر میں بحث کی گئی ہے)۔

۱۰۔ کہا جاتا ہے کہ وِدیا کا پھل اَور ہے اور اودیا کا پھل کچھ اَور۔ یہ ہم برابر اُن مُنیوں سے سُنتے آئے ہیں۔ جنہوں نے ہمیں وِدیا اور اودیا کی تعلیم کی۔

۱۱۔ جو وِدیا اور اوِدیا دونو کو جانتا ہے وُہ اودیا کے ذریعے سے مَوت سے بچتا ہے اور وِدیا کے ذریعے سے حیاتِ جاودانی پاتا ہے۔

۱۲۔ جو لوگ اُس چیز کی پرستش کرتے ہیں۔ جو سبب اوّل نہیں ہے۔ گہری تاریکی میں پڑ جاتے ہیں اور جو بلا واسطہ سببِ اوّل کے پیچھے جاتے ہیں وہ اِس سے بھی زیادہ تاریکی میں پڑتے ہیں۔

۱۳۔ کہتے ہیں کہ سببِ اوّل کے علم سے ایک بات حاصل ہوتی ہے اور اس چیز کے علم سے جو صرف درمیانی سبب سے کچھ اَور ہی حاصل ہوتا ہے۔ یہی ہم مُنیوں سے سُنتے آئے ہیں جنہوں نے ہمیں تعلیم دی ہے۔

۱۴۔ جو کوئی سببِ اوّل کو جانتا ہے اور اس کے ساتھ ہی فنا سے بھی واقف ہے۔ وُہ فنا کے ذریعے سے مَوت پر فتحیاب ہوتا ہے اور سببِ اوّل کو جاننے کی وجہ سے حیاتِ جاودانی

پاتا ہے۔

۱۵ - حقیقت کا چہرہ سونے کے ڈھکنے سے چھپا ہوا ہے۔ او آفتاب! کھول دے تو ڈھکنا۔ تاکہ مجھ سا جویانِ حقیقت اُس چہرے کو دیکھ لے۔

۱۶ - او آفتاب! تنہا آکاش میں پھرنے والا۔ سب کا سنبھالنے والا۔ او سوریا پرجاپتی کا فرزند۔ اپنی کرنوں کو الگ کر اور سمیٹ لے۔ مَیں تیرے نُور کو تیری شاندار صُورت کو دیکھتا ہُوں۔ مَیں ہُوں پُرش جو تیرے اندر ہُوں۔

۱۷ - اے میری رُوح تو جا کر ہوائے جاودانی میں مل جا اور اے جسم تو جل کر خاک ہو جا۔ اوم[۱] - او نفسِ امّارہ یاد رکھ یاد رکھ میرے اعمال کو۔ او نفس یاد رکھ یاد رکھ میرے اعمال کو۔

یہ الفاظ گویا ایسے شخص کی زبان سے ہیں جو نزع کی حالت میں ہے۔

۱۸ - او اگنی[۲]! ہمیں ٹھیک رستے سے اپنے اعمال کے پھلوں سے متمتّع کر۔ کیونکہ تو ہمارے کل اعمال جانتا ہے۔ گناہ اور بدی کی کجی کو ہم سے دُور کر۔ ہم تجھے بار بار سجدہ کرتے ہیں۔

تمام اپنشدوں میں یہ اپنشد نہائت مشکل ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنشد اور ویدانت کی اصلی تعلیم میں نجات کا دارومدار صرف اٰتمن یعنے وحدتِ وجُود کے علم حاصل کرنے پر رکھا گیا ہے۔ حالانکہ اس اپنشد میں اعمال اور کریا کرم بھی ایک درجہ تک نجات کا ذریعہ مانے گئے ہیں۔ اِسی لئے شنکر آچاریا کو اس کی شرح کرنے میں بعض جگہ دقّت پیش آئی ہے۔ لیکن اس کی دو شرحیں اَور بھی ہیں ایک تو مہیدھر کی اور دُوسری اُووٹ کی اور اِن شرحوں میں مشکل مقامات کو زیادہ فصاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ لُب لباب اسکی تعلیم کا

[۱] اوم - ایک نہائت مقدّس لفظ ہے جو ہر ایک مقدّس کتاب کو شروع کرتے وقت ایک خاص لحن سے ادا کیا جاتا ہے۔

[۲] اگنی - کے اصلی معنے آگ ہیں اور یہ وید میں ایک بہت بڑا دیوتا اور ہر قسم کی قربانی کی مقبولیت کا ذریعہ ہے۔

یہ ہے۔ کہ اگر انسان اعمال نیک کرے۔ لیکن اس نیت سے نہیں۔ کہ اُن کا پھل پائیگا۔ بلکہ محض اس نیت سے کہ ایسے اعمال کے ذریعے سے اس کو وحدتِ وجود تک پہنچنے میں مدد ملیگی۔ تب اس قسم کے اعمال اس کے کام آئینگے۔ اور ایسے کام کرتا ہُوا وُہ سو برس بھی جیے تو اسکے یہ اعمال مثل معمولی اعمال کے اسکو چمٹ نہیں جائینگے۔ اور اُسے زندگانی کے چکر یعنے سنسار میں نہیں رکھینگے۔ بلکہ وحدت وجود تک پہنچنے کے لئے اس قسم کے اعمال کی وساطت کی ضرورت ہے۔ کیونکہ وحدت وُجود کا درجہ حاصل کرنے کے لئے نیچے کے طبقات سے گذرنا لازمی ہے۔ اور بلا وساطت ان طبقات کے وہ درجہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ اِسی وجہ سے برہمن کی عمر کا پہلا حصّہ تحصیلِ علم میں صرف ہونا چاہیئے۔ اور دوسرا کاروبارِ زندگانی اور کرما کے کرنے میں اور تیسرا درجہ سنیاس ہے۔ جس میں وُہ تمام قیوُد سے چھٹ جاتا ہے اور اُسے وحدت وجود کا علم حاصل ہوجاتا ہے۔ جو شخص ان درمیانی مدارج کو چھوڑ کر ایک مرتبہ سنیاس تک پہنچنا چاہے وہ گنہگار خیال کیا جاتا ہے۔ اور اِسی وجہ سے نویں فقرے میں اور بارہویں فقرے میں کہا گیا ہے۔ کہ جو لوگ اصل کی طرف جانا چاہیں۔ یعنی بلا وساطت ایسے اعمال کے جن کا ذکر اُوپر کیا گیا۔ وہ ان سے بھی زیادہ تاریکی میں ہیں جو صرف اعمال پر بھروسا رکھتے ہیں۔ اگرچہ شنکر آچاریا نے مشکل سے بچنے کے لئے نویں فقرے میں (اودیا) سے مراد وُہ اعمال لئے ہیں جو پھل کی غرض سے کئے جائیں اور (وِدیا) سے مراد صرف دیوتاؤں کا علم لیا ہے لیکن شاستر کے رُو سے اس قسم کی (اوِدیا) پتری یوگ یعنے عالمِ ارواح میں پہنچاتی ہے اور اس قسم کی (ودیا) دیولوک یعنی اندر وغیرہ دیوتاؤں کے عالم میں پہنچاتی ہے اور وہاں پہنچنے کے بعد بھی ممکن ہے کہ بندہ وحدت وجود اور نجات کا درجہ نہ حاصل کرکے پھر سنسار کے چکر میں پڑ جائے غرض عارف جو یاں کو چاہیئے کہ سیڑھی کے سب زینے طے کرتا ہُوا وحدت وجود اور نجات مطلق کے درجے تک پہنچے۔

اگرچہ ویدانت سوتر میں مانا گیا ہے کہ بلا نیک اور بے غرض اعمال کی سیڑھی طے کئے ہوئے بھی مکتی حاصل ہو سکتی ہے لیکن ایسے اعمال کے ذریعے کو مستحسن ہی بتایا گیا ہے۔ بُدھ مذہب نے البتہ عمل کی قید بالکل اُٹھا دی۔ لیکن اس اُپنشد کی تعلیم یہی ہے کہ عارف نیک اور بے غرض اعمال کے ذریعے اپنے آپ کو تیار کرے اور بتدریج اپنے تئیں وحدتِ وجود کے درجے تک پہنچائے۔ لیکن صرف اعمال باعثِ نجات نہیں ہو سکتے۔ اگر یہ نکتہ ملحوظ رہے تو اس اُپنشد میں کوئی مشکل امر باقی نہیں رہتا۔

سیّد علی بلگرامی (از کیمبرج)

تاریخی واقعات میں اختراع کی گنجایش۔ عموماً ہر ایک علم اور ہر ایک فن میں اختراع کی گنجایش ہے جو علمی ترقی آج دنیا کو نصیب ہے وہ کہاں ہوتی بلکہ خود علوم و فنون ہی کہاں ہوتے اگر انسان میں اختراع اور دریافت کا مادہ اور شوق موجود نہ ہوتا؟ لیکن یہ امر بھی بظاہر اب تک ٹھیک معلوم ہوتا تھا کہ تاریخ کے واقعات دائرۂ اختراع سے باہر ہیں۔ خدا بھلا کرے جناب حسرت موہانی سلمہٗ کا کہ اُنہوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ من چلے لوگ تاریخ کے واقعات بھی اختراع کر سکتے ہیں۔ اگست ۱۹۰۵ء کے اُردوئے معلّےٰ میں میر مجروح کے بارے میں حضور ایڈیٹر صاحب کے قلمِ خاص کا ایک مضمون چھپا ہے اس مضمون سے دُنیا کی یہ غلط فہمی قطعی طور سے رفع ہو گئی کہ میر مہدی مجرُوح دہلی کے رہنے والے تھے۔ اس مضمون کے دُوسرے صفحے کو پڑھ کر سب کو یقین آگیا کہ میر مجروح واقعی پانی پت کے باشندے تھے۔ یہ غلط بالکل غلط کہ اُنکے باپ دادا دہلی کے تھے۔ وُہ خود دہلی میں پیدا ہوئے وہیں پرورش پائی وہیں ہوش سنبھالا وہیں جوان ہوئے اور صرف ایام غدر کے انقلابات کے چکر میں آ کر جیسے اور سینکڑوں خلائق وہ دہلی کو چھوڑ کر کہیں چلے گئے تھے وہ بھی پانی پت آ رہے تھے۔ مرزا غالب کے رقعے میں پانی پت کی اس عارضی بود و باش کی طرف اشارہ کیونکر ہو سکتا ہے واقعی حضرت موہانی کا یہ اختراع قابل داد ہے۔ ع این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ (تحقیق)

جرمن طالب علموں کی زندگی

یہ مضمون ہمارے فاضل عنایت فرما ریورنڈ ڈاکٹر وائٹ بریخٹ صاحب ایم۔ اے کا عطیہ ہے۔ پادری صاحب کو مخزن کے ساتھ شروع سے دلچسپی رہی ہے اور آپ اس رسالے کے اولین قدردانوں میں ہیں۔ پنجاب کے پادری صاحبان میں کیا باعتبارِ معلوماتِ علمی اور کیا بلحاظِ وسعتِ اخلاق آپ کا رتبہ ایسا ہے کہ محتاجِ توصیف نہیں۔ تعلیمی معاملات سے بھی آپ کو خاص تعلق ہے کیونکہ دیر تک پنجاب یونیورسٹی کے اراکین میں رہے ہیں۔ آپ اندنوں یورپ میں ہیں اور علمی مشاغل اور سیاحت کے باوجود آپ کا مخزن کو یاد فرمانا اور اس کے لئے ایسا دلچسپ اور معلومات سے بھرا ہوا مضمون بھیجنا ایک ایسا احسان ہے جس کی کافی شکرگذاری نہیں ہو سکتی :—

کچھ بہت مدت نہیں ہوئی کہ اردو میں ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس کا نام تھا "ایم اے بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی"۔ یہ کتاب اور وہ قصہ جو اس میں مندرج تھا۔ اس رائے کا اظہار تھے۔ کہ مغربی طریق پر جو تعلیم ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں ہو رہی ہیں۔ اس کے نتائج پورے اطمینان دہ نہیں ہیں۔ اور یہ رائے بعض حلقوں میں مسلّمہ ہے۔ مگر نتائج کا ناقص ہونا کچھ ایسے تعجب کا مقام نہیں ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی دنیا کے تعلیمی مرکزوں میں بھی ہر بی اے اور ایم۔ اے اس قابل نہیں ہوتا کہ یونیورسٹی کی تربیت کے تسلّی بخش نتائج دکھا سکے۔ اس امر واقعہ کے ساتھ اس بات پر بھی غور کرنا ضروری ہے کہ یونیورسٹی کا طریق ہی ہندوستان کے لئے ایک نئی چیز ہے۔ کسی نئی سرزمین میں اگر ایک سو چھوٹے چھوٹے پودے کسی اور زمین سے اکھیڑ کر لگائے جائیں تو ان میں سے ایک خاص تعداد ضرور خراب ہو جائیگی۔ گو آخر کار اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہو کہ کل درختوں کے پھل کی مقدار معمول سے بڑھ جائے۔ اسی طرح

ہندوستان میں اِس امر کی ضرورت ہے کہ یونیورسٹی کا طریق حالات ملک کے مناسب بنایا جائے اور اہل ملک کے دل اس نئے طریق کے اخذ کرنے اور اپنے آپ کو اس کے سانچے میں ڈھالنے کی طرف مائل ہوں۔ مگر دونوں جانب کی اس باہمی کشش کی تکمیل کے لئے عرصہ درکار ہے۔ اسکی تکمیل ایک پشت میں نہیں ہوسکتی۔ ہاں یہ ہے کہ تعلیم کا درخت ہندوستان میں اب بھی پھل لانے لگا ہے۔ اور جُوں جُوں زمانہ گذرتا جائیگا زیادہ پھل لائیگا۔ جو اثرات مترتب ہورہے ہیں۔ اُن کا ایک نمایاں حصّہ یہ ہے کہ اکسفورڈ اور کیمبرج کے امتحانات کی امتیازی فہرستوں سے نہایت خوش کُن شہادت ملتی ہے۔ کہ ہندوستانی طالب علم اپنے انگریز بھائیوں کے ساتھ خاص اُن کے میدان میں مقابلہ کرکے فتحیاب ہوسکتے ہیں۔ بلاشبہ یہ بہت مفید ہے کہ ہمارے ہندوستانی طلبہ میں سے بہترین طالب علم اپنے ہاں تعلیم ختم کرنے کے بعد یونیورسٹی کی تعلیم کے ایک ایسے طریق سے بھی شناسائی حاصل کریں جو اُن کی یونیورسٹیوں سے مختلف ہے۔ ہندوستان کی یونیورسٹیوں کی مشابہت لنڈن اور مانچسٹر اور لیڈز کی یونیورسٹیوں سے ہے۔ کیونکہ یہ سب زیادہ تر امتحان لینے والی جماعتیں ہیں اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داری نسبتاً بہت کم لیتی ہیں۔ اور مشترک تمدّن اور باہمی ارتباط کی زندگی اِن کے طلبہ میں موجود نہیں۔ یہ خصوصیت اکسفورڈ اور کیمبرج کے کالجوں میں ہے اور یہ کالج ان مقامات کے مخصوص ہیں۔ ان میں طلبہ نہ صرف تعلیم پانے آتے ہیں۔ بلکہ ہر کالج طلبہ کی ایک جماعت کا گھر ہے۔ جہاں وہ سب ملکر کھانا کھاتے ہیں۔ بلکہ ابتدا میں ملکر صبح و شام عبادت بھی کرتے تھے۔ گو اب یہ قاعدہ اختیاری ہوگیا ہے۔ اوائل میں یہ تمام کالج مذہبی جماعتیں تھیں۔ مگر اب یہ رشتہ لازمی نہیں رہا۔ ہاں سوشل ارتباط اب تک جاری ہے۔ اور اس کا اثر آدمی پر عمر بھر رہتا ہے اور کالج کے بعد کی زندگی میں زور سے محسوس ہوتا ہے۔ افسرانِ کالج اپنے طلبہ کے مطالعہ علمی میں مدد دیتے اور اُن کے چلن اور رویّہ کو منضبط رکھتے ہیں۔ اور یہ دونوں اثرات طالب العلم

کی زندگی کے لئے اہم ہیں۔

یونیورسٹی کا ایک تیسرا نمونہ بھی ہے۔ جو ہندوستانی اہلِ علم کی توجہ کے لائق ہے۔ اور یہ انگریزی اور ہندوستانی طریق کے بین بین ہے۔ یہ وہ نمونہ ہے جو جرمنی سے مخصوص ہے۔ میرا خیال ہو کہ اس نمونے کا مختصر سا حال جو مجھے ذاتی تجربے سے معلوم ہے۔ ناظرینِ مخزن کے لئے خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ مَیں محض یادداشت سے لکھ رہا ہوں اور اس لئے ہر باب صحیح اعداد نقل نہیں کر سکتا۔

جرمنی کے طریقِ تعلیم پر باہر سے نظر ڈالیں۔ تو وہاں کی یونیورسٹیوں کی خصوصیتیں حسب ذیل ہیں (۱) بلحاظِ آبادیٔ مُلک اُن کی کثیر تعداد (۲) ہر تعلیم گاہ میں معلموں کی کثرت اور لکچر کے ذریعے سے تعلیم دینے کے طریق پر غیر معمولی زور (۳) ایسی تحقیقات پر جو پہلے کسی نے نہ کی ہو زیادہ وقت اور قوت صرف کرنا (۴) طلبہ کی آزاد مگر میل جول والی زندگی۔ مَیں ان نکات میں سے ہر ایک کے متعلق تھوڑا تھوڑا بیان کرتا ہوں۔

قیصرِ جرمنی کی حدودِ سلطنت میں بیس سے زیادہ یونیورسٹیاں ہیں۔ حالانکہ سلطنتِ متحدہ برطانیہ میں مانچسٹر اور شفیلڈ وغیرہ کو چھوڑ کر جہاں حال ہی میں یونیورسٹیاں قائم ہوئی ہیں۔ یونیورسٹیوں کی تعداد اس کا نصف ہے۔ جرمن میں تعداد طلبہ بھی انگلستان کے طلبہ کی تعداد سے بہت زیادہ ہے۔ یہ اس لئے ممکن ہوا کہ جرمنی میں یونیورسٹی کی تعلیم کا خرچ انگلستان کے خرچ سے بہت کم ہے۔ انگریزی یونیورسٹیوں میں سے اکثر کی قرونِ وسطیٰ میں بنا ڈالی گئی تھی۔ جرمنی کی تعلیم گاہیں بالعموم سولہویں صدی عیسوی کے زمانہ اصلاح کی یادگار ہیں۔ جرمنی میں یونیورسٹیوں کی کثرت کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ کہ ۱۸۷۰ء تک ملک کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا۔ ہر ریاست کا حکمران اپنے ہاں ایک تعلیمی مرکز رکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ۱۶۹۴ء میں پرشیا کے بادشاہ کے ماتحت ہالے کی یونیورسٹی قائم ہوئی۔ باوجودیکہ اس کے

بہت قریب لیپزگ کی پرانی یونیورسٹی سنہ ۱۴۰۰ء سے چلی آتی تھی - جو سکسنی کے بادشاہ کے ماتحت تھی - مگر لطف یہ کہ باوجود اس قرب کے یہ دونوں اور بہت سی اور نہایت خوشحال تعلیم گاہیں ہیں - جن میں ہزاروں طالب علم ہیں - اور جن کے معلّم تمام ممالک میں اپنی فضیلت کے باعث مشہور ہیں - جرمنی میں صدیوں سے یہ دستور چلا آیا ہے کہ سرکار تعلیم عامّہ اور علوم و فنون لطیفہ کی امداد بڑی فیاضی سے کرتی ہے - اور اس بارے میں وہاں کا طریقِ عمل انگلستان کی حکومت سے مختلف ہے - یہاں اُنیسویں صدی تک یہ حال تھا کہ تعلیم کے لیئے یا تو خاص خاص فیاض اشخاص سے بڑی بڑی رقمیں ملیں - جیسا کہ اکسفورڈ اور کیمبرج کے کالجوں کے قیام کے وقت اور یا مذہبی جماعتوں سے امداد ملی - جیسا کہ انگلستان کے چرچ (گرجا) کی طرف سے ساری قوم کی ابتدائی تعلیم کا ایک سلسلہ اُنیسویں صدی میں جاری کیا گیا - اور اس کے مصارف چرچ کے سرمایہ سے دیئے گئے - جرمنی میں ایسی چیزیں ہمیشہ حکومتِ وقت سے متعلق رہی ہیں اور اب تک بھی ہیں - جو لوگ اپنے طور پر بھی کوئی قابلِ قدر دریافت یا ایجاد کرتے ہیں - ان کو سرکاری امداد جرمنی میں انگلستان کی نسبت زیادہ مستعدی اور زیادہ کشادہ دلی سے دی جاتی ہے -

جرمنی یونیورسٹیوں میں تعدادِ معلّمین کے تہیّہ میں بھی دریادلی برتی جاتی ہے اور یہ اُنکی ایک بڑی خصوصیت ہے - ان میں تعلیمی صیغوں کی یہ تقسیم پُرانے زمانے سے مروّج ہے - کہ چار شعبے تسلیم کیے جاتے ہیں - ہر شعبہ یا فیکلٹی ایک علم سے مخصوص ہے - دینیات[1] - فلسفہ - قانون اور طب - علم طبعیات فلسفے میں شامل ہے اور اس کی شاخ سمجھا جاتا ہے - ہر شعبے میں ایک مکمل گروہ اساتذہ کا موجود ہے - یہ پروفیسر تین قسموں میں منقسم ہیں - "معمولی" - "غیر معمولی" اور "اتالیق" ان میں جو "استادِ معمولی" کے لقب سے ملقب ہیں - وہ گویا مستقل معلم ہیں - "غیر معمولی" اُن اُستادوں کا نام ہے جو "معمولی" پروفیسروں کے سوا زائد کام کے لیئے وقتاً فوقتاً مقرر کیئے جاتے ہیں - اور

[1] اس تقسیم کو دیکھکر اسلامی درسگاہوں کا پرانا اصول یاد آتا ہے جب تقسیم اس اصول پر تھی کہ العلم علمان - علم الادیان و علم الابدان (ایڈیٹر)

"اُتالیق" ایک قسم کے امیدواران معلمی ہیں جو یونیورسٹی سے سند حاصل کر چکے ہیں کہ وہ اپنا مضمون پڑھانے کی قابلیت رکھتے ہیں - مگر انہیں تنخواہ کوئی نہیں ملتی - اور ان کا گذارہ یا فیس پر ہوتا ہے اور یا اپنی علمی تالیفات وغیرہ پر - مگر دونوں آمدنیاں بہت قلیل رہتی ہیں -

مصارف تعلیم کا یہ طریق عملاً کام نہ دے سکتا - اگر علمائے جرمن کفایت شعاری کے نمونے نہ ہوتے - انکو جو تنخواہیں یا وظائف سرکار سے ملتے ہیں وہ ایسے کہ اگر وہ ہندوستان میں کسی گورنمنٹ کالج کے پروفیسر کو ملیں تو وہ انہیں نہائت ہی ناکافی سمجھے - حالانکہ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں یورپ بھر میں شہرت حاصل ہو - ان کو طلبہ کی فیس سے ضرور آمدنی ہے - مگر یہاں فیس کی مقدار اتنی کم ہے - کہ تاوقتیکہ کسی پروفیسر کے پاس طلبہ کی کثیر تعداد نہ ہو - اس آمدنی سے بھی انہیں کوئی معتد بہ امداد نہیں ملتی - اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی - تو مجھے دینیات اور فلسفے کے شعبوں میں نصف سال تک لکچر سننے کے لئے بارہ[1] روپئے سے زیادہ نہیں دینے پڑے تھے - بیشک اس طریق میں یہ فائدہ ہے کہ غریب اور جفاکش طلبہ کے لئے یونیورسٹی کی تعلیم ارزاں ہو جاتی ہے -

تعلیم بذریعہ لکچروں کے ہوتی ہے - جو عموماً گھنٹہ بھر کے ہوتے ہیں - ہر لکچر کے بعد ایک وقفہ پندرہ منٹ کا ہوتا ہے - تاکہ دماغ دوسرے مضمون کے لئے تیار ہو جائے - اس کے بعد دوسرا لکچر شروع ہوتا ہے - اکثر ایسا بھی ہو جاتا ہے - کہ کوئی اُستاد زیادہ سرگرم ہوا - یا اپنے مضمون میں ایسا منہمک ہو گیا - کہ اپنا وقت ختم ہو جانے کا خیال نہ کرکے برابر تقریر کرتا چلا گیا - مگر جب وقت پر لکچر ختم ہو جائے تو طالب علم عموماً یونیورسٹی کی عمارت میں ادھر اُدھر چہل قدمی کرتے رہتے ہیں - یا اگر موسم اچھا ہوتا ہے تو باہر میدان میں ٹہلتے رہتے ہیں - اکثر لکچروں کے

[1] اس سے صاف طور پر معلوم نہیں کہ اب تک تعلیم کی ارزانی کی یہی کیفیت ہے - اگر یہی ہے تو جرمن کی علمی ترقی کا گُر بہ آسانی معلوم ہو جاتا ہے - افسوس کہ ہندوستان میں ابھی ترقی شروع نہیں ہوئی تھی - کہ میلان اسکے برعکس ہو گیا - (ایڈیٹر)

نوٹ مفصل لئے جاتے ہیں۔ اور طالب علم انہیں گھر جاکر یاد کرتا ہے۔ اور بعد میں انکو احتیاط سے مجلّد کراکے رکھتا ہے۔ اُن پروفیسروں کے لکچروں پر خاص توجہ رہتی ہے۔ جنکے ممتحن بننے کی خبر ہوتی ہے۔ ہر طالب علم ایک چمڑے کا بستہ سا رکھتا ہے۔ جس میں اپنے لکچروں کے نوٹ لئے لئے پھرتا ہے۔ اور اس بستے سے آسانی سے شناخت ہو سکتا ہے۔ جو طالب علم محتاط اور کفایت شعار ہوتے ہیں وہ اپنی دائیں آستین پر ایک سیاہ کپڑے کی آستین نوٹ لکھتے وقت چڑھا لیتے ہیں۔ تاکہ اُن کا کوٹ اور قمیص خراب نہ ہو۔ اگر پروفیسر زیادہ تیز بولتا ہے۔ یا اپنے وقت سے تجاوز کرنے لگتا ہے۔ تو سامعین اپنے پاؤں فرش پر رگڑ کر شور کرتے ہیں اور اس سے اظہارِ ناراضگی مقصود ہوتا ہے۔

"ہر معمولی" پروفیسر کا فرض ہے۔ کہ ہر ٹرم[1] میں ایک سلسلہ عام لکچروں کا بھی جاری رکھے۔ جن کے لئے کوئی فیس نہیں لی جاتی سوائے اس کے کہ سامعین اُس سلسلے کے لئے نام درج کراتے وقت اندراج کی قلیل سی فیس دیتے ہیں۔ لیکن طلبہ کی اصل تعلیم "پرائیویٹ" لکچروں کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ جن کے لئے فیس دینی پڑتی ہے۔ گو وہ انہی کمروں میں ہوتے ہیں جن میں عام لکچر۔ ایک تیسری قسم لکچروں کی ہوتی ہے جسے "نہایت پرائیویٹ" کہتے ہیں۔ یہ عموماً پروفیسر کے مکان پر ہوتے ہیں۔ اور ان کا منشا زیادہ ہوشیار اور ہونہار طلبہ کو فائدہ پہنچانا ہوتا ہے۔ میں ذاتی تجربے سے یہ کہہ سکتا ہوں۔ کہ یہ بہت مفید ہوتے ہیں۔ ان سبقوں میں تعلیم محض رسمی نہیں ہوتی۔ اور جس مضمون پر بحث ہوتی ہے۔ اُس کے متعلق ایک ماہر فن علامہ سے سوال و جواب کرنا نہ صرف معلومات کو بڑھاتا ہے۔ بلکہ طبیعت کو تیز کرتا ہے۔

یونیورسٹی کے سال میں دو ٹرم ہوتے ہیں۔ سرما کا ٹرم جو اکتوبر سے اپریل تک رہتا ہے۔

---

[1] لفظی معنے میعاد مقررہ۔ اصطلاحاً وہ زمانہ جو یونیورسٹی میں ایک تعطیل اور دوسری تعطیل کے درمیان گزرتا ہے۔ اور جس میں تعلیم جاری ہوتی ہے۔ (ایڈیٹر)

اور گرما کا ٹرم جو مئی سے اگست تک ہوتا ہے۔ موسم بہار کی تعطیل پانچ یا چھ ہفتے کی ہوتی ہے اور موسم خزاں کی تعطیل آٹھ سے دس ہفتے تک کی ہوتی ہے۔

جرمن پروفیسروں کی تنخواہیں گو قلیل ہیں۔ مگر حکومت کی طرف سے تحقیقات کے نتائج کی معقول حوصلہ افزائی ان کے اپنے شوقِ علم سے ملکر یہ نتیجہ پیدا کرتی ہے۔ کہ وُہ اپنے اپنے شعبے کی تحقیقات جدیدہ میں دُوسرے ممالک کے علما کی نسبت زیادہ استقلال اور زیادہ عُمدگی کے ساتھ مصروف رہتے ہیں۔ کسی اَور ملک میں اتنی کثیر جماعت فُضلا کی ہمیشہ احاطۂ علم انسانی کے وسیع کرنے کی فکر میں لگی ہُوئی نہیں ہے۔ یہ ہر طرح کی تکالیف برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ صرف اتنی بات کے لئے کہ کوئی چیز جو دریافت ہوئی ہے اسکو اچھی طرح پرکھ لیں یا کوئی نئی بات اس پر بڑھا سکیں۔ خواہ وُہ کتنی ہی خفیف کیوں نہ ہو۔ جرمن طلبہ میں انہی خُوبیوں کی وجہ سے ایک نقص بھی پیدا ہوگیا ہے۔ اور وجہ یہ ہے کہ وُہ بعض باریک مسئلوں میں جن سے کچھ عملی فایدہ نہیں یا بعض فرضی مسائل میں جنکی حقیقت میں بُنیاد نہیں۔ لگ جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی یہ ماننا پڑتا ہے کہ انکو جو خالص محبت علم سے ہے۔ جس میں غرض شامل نہیں۔ اور جو مستقل عزم علمی ترقی کا وُہ ہمیشہ رکھتے ہیں۔ ایسے خواص ہیں کہ دُنیا کو اُن سے بہت فائدہ پہنچا ہے۔ اور کیا یہی وہ خواص نہیں جنہیں ہم اپنے ہندوستانی نوجوانوں میں پیدا ہوتے اور ترقی پاتے دیکھنا چاہتے ہیں؟ اُن لوگوں میں بھی جو ہندوستان کے صیغۂ تعلیم کی خدمت میں مصروف ہیں۔ کتنے ایسے نکلینگے جو ذرا سی زیادہ آمدنی کی اُمید پر فوراً علمی مشاغل کو خیرباد کہہ کر کسی دُوسرے صیغے میں جانے کو تیار نہ ہوں۔ حالانکہ اگر حضرت سلیمانؑ کا قول درست ہے "تو دانش کی قیمت لعل و جواہر سے زیادہ ہے"۔

اگرچہ میں نے یہ بیان کیا ہے کہ انگلستان کی مشہور یونیورسٹیوں کی سوشل زندگی کا جواب جرمنی میں نہیں۔ لیکن اِس سے یہ مراد نہیں کہ وہاں کے طلبہ کی زندگی میں سوشل پہلو

بالکل ناپید ہے۔ اُن کا طریق جدا ہے اور اُن کی قومی اغراض کے مطابق ہے۔ مگر وُہ بھی لطف سے خالی نہیں۔ رواجِ قدیم کے اثر سے وہاں کے طلبہ کی جماعت کئی فریقوں پر تقسیم شدہ ہے۔ ایک حصّہ اُن طلبہ کا ایسی مجالس کے متعلق ہوتا ہے۔ جیسے انگریزی تعلیم گاہوں کے یُونین۔ ہر یُونین کی اپنی خاص ٹوپی اور خاص اپنا رنگ ہوتا ہے۔ جس سے شناخت کیے جاتے ہیں۔ ایک رنگین فیتہ بھی حمائل ہوتا ہے۔ جس کا ایک حصّہ کوٹ سے ڈھنپا رہتا ہے۔ اِن مجالس میں سے بعض میں ڈوئیل[1] کا رواج ہے۔ اچھّے خاندان کے طالبِ علم کے متعلق خصوصاً اگر اُس کا ارادہ فوجی ملازمت کا ہو۔ یہ عام خیال ہے کہ اس کی عزّت پر ذرا سی بات سے دھبّا آسکتا ہے اور اگر کوئی ذرا بھی اس کے خلافِ شان بات کہے تو اُس پر لازم ہے کہ تیغِ آبدار سے اُس کا بدلا لے۔ اور اپنے مخالف کو لڑ کر فیصلہ کرنے پر مجبور کرے۔ مگر یہ قاعدہ ہے کہ لڑائی ایسی احتیاط سے ہو کہ مخالف کی جان نہ جائے۔ صرف زخم لگانا جائز ہے اور وُہ بھی مُنہ پر۔ اس میں بھی یہ تاکید ہے۔ کہ تلوار کی نوک سے کام نہ لیا جائے۔ بلکہ اس کی دھار سے۔ طلبہ کا یہ فریق عموماً اپنے زخموں پر نازاں ہوتا ہے۔ اور اگر کسی اصلی نزاع کا موقعہ نہ پیش آئے۔ تو ڈوئل والی جماعتیں قرونِ وسطیٰ کے بہادروں کی طرح ایک دُوسرے کو پیغامِ جنگ دیتی ہیں۔ تاکہ یہ رسم قائم رہے تعجب کا مقام ہے کہ قرونِ وسطیٰ کی یہ وحشیانہ رسم اس وقت تک جرمنی کی اعلیٰ ترقی یافتہ تعلیم گاہوں اور یورپ بھر میں سب سے بڑھی ہُوئی قواعد داں فوج میں باقی ہے۔ مگر اب دن بدن گھٹتی جاتی ہے اور غالباً ایک دو پشت کے بعد ڈوئل کا رواج محض ماضی کا فسانہ رہ جائے گا۔

سب یونین اس لڑنے کے رواج میں شامل نہیں۔ مگر سب بمعہ اُن طلبہ کے جو کسی یُونین سے متعلق نہیں۔ سوشل میل جول کے لیے "کریسپ" میں جاتے ہیں۔ یہاں بیئر (جو کی شراب) کا دور چلتا

[1] پرانا دستور جس میں دو آدمی مسلّح ہو کر لڑتے ہیں۔

ہے۔ دو ہزار سال سے یا اس سے بھی زیادہ مدت سے بیر اہل جرمنی کی قومی شراب چلی آتی ہے۔ عموماً یہ بہت ہی ہلکی بنائی جاتی ہے۔ اور اسی لئے اس سے کبھی کوئی بدمست نظر نہیں آتا۔ یہاں اس دور کے ساتھ گیتوں اور لطیفوں کا بھی دور چلتا ہے اور جن نئے طلبہ میں نظمیں یا ہجویں لکھی ہوں وہ بھی یہاں پڑھی جاتی ہیں۔ کھیلوں میں بعض طالب علم انٹا کھیلتے ہیں۔ بعض تیغ زنی اور دوسری ورزشیں کرتے ہیں اور چند سالوں سے بعض انگریزی کھیلیں بھی کھیلنے لگے ہیں۔ مثلاً فٹ بال اور کشتی رانی۔ مگر گیند بلا ابھی جرمن میں مقبول نہیں ہوا۔ اندنوں جرمن طلبہ میں بھی کچھ لوگ "ٹی ٹوٹلر" یعنے شراب سے قطعی پرہیز کرنے والے ہو چلے ہیں۔

جرمن طلبہ کی زندگی کے مذکورہ بالا پہلو کی وجہ سمجھنے کے لئے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ہر جرمن نوجوان جو تندرست اور قابل خدمت ہے۔ مجبور ہے کہ ملک کی فوجی خدمت کچھ عرصے کے لئے کرے۔ بیس برس کی عمر میں اسے پیش ہونا پڑتا ہے۔ اگر یونیورسٹی کا داخلہ پاس کیا ہوا ہو تو اس کی فوجی خدمت کی میعاد بجائے تین سال کے ایک سال ہوتی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے کو کسی ایسے مقام میں گذارے جہاں یونیورسٹی ہو۔ تاکہ اس کی تعلیم کا کام بھی جاری رہ سکے۔ اسی لئے یہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔ کہ لکچر کے کمرے میں وردی پوش جوان بیٹھے ہیں۔ مگر عموماً ان کے فرائض ایسے سخت ہوتے ہیں۔ کہ لینے سے کوچ یا پریشان سے دن کے بعد ان میں زیادہ پڑھنے کی ہمت باقی نہیں رہتی۔ جسمانی ورزش کے اس عملی مدرسے سے ہر جرمن کو گذرنا ہوتا ہے اور اسی کے ذریعے اس کا جسم مضبوط ہو کر زندگی بھر کے اہم کاموں کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ جن میں انسان کی ساری قوت درکار ہوتی ہے +

ایچ۔ یو۔ وائٹ بریخٹ

گلبازیِ یا گلباریِ

یُونتو ہر ملک کے میلے اور تماشے اپنی اپنی جگہ دلچسپ ہوتے ہیں۔ اور کونسا آباد ملک ہے جو اپنی دلچسپیوں سے خالی ہے۔ مگر چند ہفتے ہُوئے مجھے بولون علاقہ فرانس میں ایک نہائت اُجلا میلا نظر آیا۔ جس میں اہلِ شہر نے کمال نفاستِ مذاق سے کام لیا تھا۔ اور جسے دیکھنا شمالی فرانس کی زندگی کے ایک نادر پہلو کو دیکھنا تھا۔ اِس کے فرانسیسی نام کا لفظی ترجمہ تو "پھولوں کی لڑائی" ہے۔ مگر چونکہ اِس میں ایک پُرانے ایشیائی کھیل کا اصُول موجود ہے۔ اِس لئے ہم اِسے "گل بازی" کہہ سکتے ہیں۔ لیکن جس کثرت سے اس میں دو گھنٹے تک پھول برسا کئے۔ اگر اُس کثرت کو ملحوظ رکھیں تو اُسے گلباری کہنا زیادہ موزون ہوگا۔

بولوں شمالی فرانس کے اُن مقامات میں سے ہے۔ جہاں لوگ جولائی اور اگست کے مہینوں میں گرمی بسر کرنے جاتے ہیں۔ نہ صرف قُرب وجوار کے فرانسیسی آتے ہیں۔ بلکہ پیرس تک سے لوگ سمندر کے ساحل کی کشش سے کھنچے آتے ہیں۔ گو ساحل کی زندگی کا شوق فرانس میں اُس درجے پر نہیں ہے۔ جس پر انگلستان میں بولوں چونکہ انگلستان کے ساحلِ جنوبی کے مقابل واقع ہے۔ اس لئے انگریز بھی اس موسم میں کثیر تعداد میں بولوں کی رونق کو بڑھاتے ہیں۔ اور ہے بھی مزے کی بات فوکسٹن سے ساحل پر کھڑے ہو کر دیکھو تو بولوں نظر آتا ہے۔ جہاز پر سوار ہو جاؤ تو رود بار عبور کر کے گھنٹے سوا گھنٹے میں بولوں آ سکتے ہو۔ ادھر ریلوے اور جہاز کی کمپنیاں خلقت کا رجوع دیکھ کر کرایہ بھی کم کر دیتی ہیں۔ اور اس تخفیف سے ہر دل میں

اُمنگ اُٹھتی ہے۔ کہ ذرا سی ہمت اور تھوڑے سے خرچ سے ایک نئی سرزمین دیکھی جا سکتی ہے۔ کیوں نہ دیکھ لیں۔ بس ایک سیل سا اُمنڈ آتا ہے۔ جدھر جاؤ۔ انگریزی اور فرانسیسی کی آواز ملی ہوئی کان میں پڑتی ہے۔ انگریز زباندانی میں ممتاز نہیں۔ اِس لئے باوجود صدیوں کی ہمسائگی اور کثرتِ آمد و رفت کے اور باوجود یکہ اکثر مدارسِ انگلستان میں فرانسیسی سبقاً پڑھائی جاتی ہے۔ اِس کے بولنے سے عاری ہیں۔ اور اگر بولنے بھی لگیں تو چند فقروں سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اور اس میں بھی تلفظ کی غلطی عام سی بات ہے۔ مگر خیر فرانسیسی دُکاندار بھی اپنی زبان کے قتلِ عام کا بدلا انگریزوں سے لئے بغیر نہیں رہتے۔ وُہ بھی دوکان پر لکھ رکھتے ہیں "یہاں انگریزی بولی جاتی ہے" تاکہ انگریزی بولنے والا گاہک آئے اور جب آتا ہے۔ تو عموماً جیسی اسکی فرانسیسی ہوتی ہے ویسی اِن کی انگریزی۔ عوض معاوضہ گلہ ندارد۔ کام تو چل جاتا ہے۔ مگر اِنسان خود فریقین میں نہ ہو تو دُور سے اس تماشے کا دیکھنا لُطف خاص رکھتا ہے۔ فرانسیسی آدمی جہاں الفاظ جواب دیتے ہیں۔ حرکات سے کام لیتا ہے۔ اور اثنائے گفتگو میں اُس کے شانے بیحد ہلتے ہیں۔ اور انگریز جُوں جُوں سمجھنے یا سمجھانے میں قاصر رہتا ہے گھبراتا ہے۔ مگر ہم گلباری سے دُور رہے جاتے ہیں۔

گلباری میں سب شریک ہوتے ہیں۔ مسافر اور مقیم۔ انگلستان سے آئے ہُوئے مہمان اور فرانس کے اہلِ وطن۔ بوڑھے اور جوان۔ عورتیں اور بچے۔ بانکے چھیلے اور سیدھے سادے کون ہے جو احاطے کے اندر داخلے کے چند پیسے دے سکتا ہے اور نہیں جاتا۔ عین کنارِ آب پر ایک تماشا گاہ ہے۔ جس کے متعلق ایک باغچہ ہے۔ وہی باغچہ اس مرتبہ اس میلے کے لئے مقرر تھا۔ کئی دِن پہلے سے تیاریاں تھیں۔ اس کی روشیں آراستہ کی گئی تھیں۔ اور روشوں کے دونو طرف نشست کا سامان تھا۔ ایک طرف اُونچے اُونچے عارضی چبوترے۔ جنپر ممتاز لوگ جو مدعو تھے یا جنہوں نے زیادہ قیمتی ٹکٹ خریدے تھے۔ بیٹھ سکیں۔ اور دُوسری طرف

صرف بنچ اور کہیں کہیں کرسیاں - جن پر اُن سے کم قیمت ٹکٹ لیکر لوگ بیٹھ سکیں - صبح سے گلفروشوں کی دوکانیں غیر معمولی طور پر پھولوں سے پُر نظر آنے لگیں - اور دوپہر کے بعد اُس باغیچے کے قریب بھیڑ بھاڑ شروع ہو گئی - اور اس کی سڑک پر دوکانوں کی قطاریں ہندوستان کے میلوں کی طرح لگ گئیں - چار بجے اصل تماشا شروع ہوا - تمام نشستیں تماشائیوں سے پُر تھیں اور اُن کے سوا ایک بڑی تعداد ایسے تماشائیوں کی تھی - جو صرف داخلہ کا ٹکٹ رکھتے تھے اور انہیں میلے کے ہر حصے میں چلنے پھرنے کی اجازت تھی - مگر اُن کے لئے بیٹھنے کا کوئی انتظام نہ تھا - سب تماشائی پھولوں سے جھولیاں بھرے ہوئے تھے - "گو جھولی" - بجائے کُرتے یا دوپٹے کی جھولی کے کاغذ کی جھولی تھی - اور بعض زیادہ دولتمند لوگ نہائت خوشنما اور قیمتی گلدستے لئے کھڑے تھے - کہ اتنے میں سواریِ گُل کی آمد آمد ہوئی - تحسینِ گل کا شور اُٹھا اور سب متوجہ ہو گئے -

سب سے آگے ایک گاڑی تھی - ہمہ تن گُل - گھوڑا تو سر سے پاؤں تک پھولوں سے سجا ہوا - پہیے پھولوں سے اٹے ہوئے - پُشت ایک تختۂ گُل - اور وسط میں ایک خوبصورت ٹوکری پھولوں کی - غرض اندر پھول - باہر پھول - اُس میں ایک عزّز فرانسیسی لیڈی ایک پھول سے بچے کو ساتھ لئے بیٹھی تھی - چہرے پر باریک پھولدار نقاب - ٹوپی پر پھول اور تکیے پر پھولوں کی چادر - اس پر پھول برسنے شروع ہوئے - دونوں طرف سے بوچھاڑ ہوتی تھی اور وہ ایک ہاتھ سے گھوڑے کی باگ تھامے ہوئے ایک ہاتھ سے سب کا جواب دیتی جاتی تھی - اس گاڑی کے پیچھے ایک دوسری گاڑی تھی - جس کی سجاوٹ اس سے کچھ کم نہ تھی - صرف رنگ آمیزی میں فرق تھا - ہر گاڑی کی سجاوٹ میں ہر کسی نے اپنے اپنے مرغوب رنگ لگائے تھے اور اپنی پسند کے گُل کھلائے تھے - اس میں چار لڑنے والیاں تھیں اور گھوڑے کی باگ کوچبان سنبھالے ہوئے تھا - جسے صفِ گُل میں بیٹھنے کا انعام برابر مل رہا تھا - کئی دل لگی باز نشانہ اُڑاتے تھے اور وہ جواب نہیں دیسکتا

تھا۔ سر جھکائے ہوئے گاڑی ہانکتا جاتا تھا۔ اس گاڑی کا چبوتروں کے سامنے آنا تھا۔ کہ چوکھیا لڑائی ہونے لگی۔ لوگ ہزاروں تھے تو کیا ہوا۔ یہ چار چنچل نار تھیں۔ ان سے کون بازی جیت سکتا تھا۔ جس طرف سے پھول آتا تھا۔ اُسی طرف جواب جاتا تھا۔ کوئی گلدستہ پھینکتا تھا تو ادھر سے بھی فی الفور اُسی پر بوچھاڑ ہوتی تھی۔ کسی کا وار خالی گیا۔ تو یار لوگ ہنس دیئے۔ کسی نے تاک کر پھول مارا۔ تو واہ وا ہوگئی۔ ان کے پیچھے ایک اور سواری تھی جس میں اس پرانی رسم پر بیسویں صدی کا پیوند لگایا گیا تھا۔ یعنی موٹر کار۔ اسی طرح پھولوں سے لدی ہوئی۔ اس میں مرد اور عورتیں دونو سوار تھے اور چلانے والے کے سوا سب ہاتھ چلا رہے تھے۔ ایک گاڑی آئی جس میں بہت سے بچے تھے۔ ان کا آنا چھوٹے بڑے سب کے لئے اشارہ تھا کہ "برس پڑو"۔ خصوصاً ہم عمروں سے ان کی خوب رہتی تھی۔ اس کے پیچھے ایک اور گاڑی آئی۔ جس میں ایک زندہ دل بوڑھا اپنی بڑھیا کو لئے جلوس گلی میں شامل ہو لیا تھا۔ کوئی نہ کوئی خدا ترس ان کی طرف بھی پھول پھینک دیتا تھا اور یہ بھی بہت کشادہ دلی سے پھول برساتے جاتے تھے۔ مگر عام دلچسپی اس گاڑی سے بہت کم تھی۔ اور چشم عبرت کو یہ سبق ملتا تھا۔ کہ ایسے کھیل ایک خاص وقت تک ہی موزوں ہیں۔ اور جیتے جی ہی وہ زمانہ آجاتا ہے۔ جب زندگی کی بہت سی خوشیوں کو خیرباد کہنا ہوتا ہے۔ اسی طرح اور سواریاں تھیں جن میں ہر شخص نے اپنی توفیق اور شوق کے مطابق سجاوٹ کی تھی اور یہ قطار کی قطار باغ کے گول چکر میں چلتی تھی اور وسط صحن میں باجا بجتا تھا۔ چھ بجے تک یہ چکر جاری رہا۔ آخر کب تک چلتا۔ ہر انسانی خوشی محدود ہے۔ اور کیسی ہی پر لطف کیوں نہ ہو آدمی خود اس سے تھک جاتا ہے اس دو گھنٹے کے عرصے میں کئی پھولوں کی جھولیاں بار بار خالی ہوئیں اور بار بار بھری گئیں۔ پھول والے ٹوکرے بھرے بیٹھے تھے میلے کے ختم ہونے سے پہلے سب بیچ کر فارغ ہو گئے۔ گاڑیوں میں بھی کئی دفعہ پھولوں کے نئے ذخیرے کی مانگ ہوئی۔ مگر کتنا ہی بڑا خزانہ ہو جب دونو

ہاتھ سے لٹایا جاوے - تو کہاں تک ساتھ دیگا - آخر پھول ختم ہو چلے - گھڑیال نے بھی آواز دی کہ جشن کے لئے وقت کے اٹل قانون نے جتنے منٹ اور جتنے ثانیے فیاضی سے عطا کئے تھے - سب ہو لئے - ہاتھ جو برابر مصروفِ ورزش رہے تھے - پکار اٹھے کہ اب استراحت درکار ہے - گھوڑے چکر لگاتے لگاتے تھک گئے - اور فطرتِ انسانی کا مجموعہ جو انبوہِ تماشائیاں میں نمودار تھا - اپنی تغیر پسندی کا ثبوت دینے لگا - تماشائی ایک ایک دو دو کرکے کھسکنے لگے - اور آخر پھولوں والی گاڑیاں جس ترتیب سے آئی تھیں - اسی ترتیب سے قطار باندھے ایک بیرونی چکر سے گھوم کر باہر سڑک پر جا نکلیں - مکانوں کے بالاخانوں پر اس واپسی کے دیکھنے کے لئے ہجوم ہو گیا - کہیں کہیں سے پھول بھی برسے - مگر تھوڑی دور جا کر یہ قطار منتشر ہو گئی اور ہر ایک نے اپنا اپنا راستہ لیا -

میں اس میلے کو دیکھ کر آیا - تو ایک ہجومِ خیال ساتھ لایا - گل باری کی پہلی جھلک دیکھی تو خیال آیا کہ کیا اچھا ہو اگر کوئی ملک ایسا ہو جہاں روز اسی طرح پھول برسا کریں - میلے کے ختم ہونے کی کیفیت دیکھی تو اس خیال کی اصلاح کی کہ پھول برسنے کا لطف ہی جاتا رہے اگر روز یہ سامان میسر ہو - میلے کی بے تکلفی نے اپنے ملک کی ہولی یاد دلائی - عجب نہیں کہ ہندوستان کے اس تیوہار کے بانیوں نے ایسی ہی بے ضرر دل لگی اور چہل پہل کے لئے ہولی کی رسم جاری کی ہوگی - اور مصفا آب گلرنگ ایک دوسرے پر چھڑکنا ابتدائی دستور ہوگا - مگر حضرتِ انسان کہیں ایک بات پر قرار پکڑتے ہیں - ایک سے ستم ایجاد ہیں - وہ وہ ایجادیں اس رنگ میں کیں - کہ ہولی کو ہولا بنا دیا - مزاج تغیر پسند تو قدرتاً واقع ہوا ہے - فرق صرف یہ ہوا - کہ دنیا کے مغربی حصے میں گذشتہ چند صدیاں اس تغیر کی نذر ہوئیں جسے ترقی کہتے ہیں اور ہم اس تغیر کی طرف مائل رہے جس کا نام ترقیِ معکوس ہے - میں نے انگریزوں کو فرانسیسیوں کے گروہ میں دیکھا - تو خیال کیا کہ برابر کے جوڑ

ہیں۔ جبھی تو اندنوں میل ملاپ ہو رہا ہے۔ صدیوں کی لڑائی اور مخالفت کے بعد ایک کے دل میں دوسرے کی وقعت پیدا ہو گئی ہے اور دونوں نے محسوس کیا ہے کہ ناحق لڑنے جھگڑنے سے بہتر ہے کہ دونو ہمسایہ قومیں صلح سے رہیں اور باہمی موافقت سے دونو دُنیا میں اپنا رعب بڑھائیں اور ایک دوسرے پر گولہ باری کرنے کی بجائے ایسے جلسوں میں جمع ہو کر ایک دُوسرے پر گل باری کریں۔ اِس بھیڑ بھاڑ میں اپنی طرف خیال گیا۔ اس مجمع اغیار میں ایک میں اور ایک میرا رفیق دو ہندوستانی تھے۔ سوچا کہ ہم کیا ہیں اور کہاں ہیں۔ ع۔ مثلِ گلِ بازی نہ اِدھر کے نہ اُدھر کے۔ ہم پر کیا موقوف۔ جاپان کو چھوڑ کر ساری ایشیائی قومیں اقوامِ یورپ کے ہاتھ میں گُل بازی بنی ہوئی ہیں۔ وُہ جو سلوک چاہیں کریں۔ ہاں اگر انہی گلوں میں قوتِ اجتماع پیدا ہو جائے۔ تو شاید اِدھر اُدھر پھینکے جانے سے محفوظ ہو جائیں۔ فرانس اور انگلستان کی مصالحت آج سے دس برس پہلے کون باور کر سکتا تھا۔ کہ ممکن ہو گی۔ اِسکو دیکھ کر سعدیؒ کا قول یاد آیا۔ "کہ ختن و ختا صلح کردند"۔ "اما زید و عمر را ہنوز خصومت باقی است"۔ فرانس اور انگلستان جیسے صدیوں کے دشمن مل جائیں اور ہم ہندوستانی ہندو مُسلمانوں کے ملاپ کو ترسا کریں۔

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم

عبد القادر (از لندن)

علم الاقتصاد یا سیاست مدن (مصنفہ شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے) جسمیں علم الاقتصاد کے دقیق اصُول کی توضیح کرتے ہوئے مصنف نے ہندوستان کے موجودہ تمدنی اخلاقی اور اقتصادی حالات کیطرف لطیف اشارات کئے ہیں جن سے پڑھنے والے کی نظر وسیع ہوتی ہے اور اسکو مسائل اقتصادیہ پر آزادانہ طور پر غور و فکر کرنیکی تحریک ہوتی ہے۔ منگا کر دیکھئے (عمر کو مخزن ایجنسی لاہور سے ملتی ہے) محصُول ڈاک علاوہ۔

اطالیہ

اٹلی کے حالات کے متعلق مندرجہ ذیل دلچسپ مضمون ہمارے مکرم لالہ لاجپت رائے صاحب وکیل چیف کورٹ پنجاب نے عنایت کیا ہے صاحب موصوف ان دنوں بحیثیت کانگرس ڈیپوٹیشن کے ممبر ہونے کے یورپ میں تشریف رکھتے ہیں اور سرزمین اٹلی کی انہوں نے انگلستان جاتے ہوئے زیارت کی ہے انہیں اس ملک کے تاریخی حالات کا عرصے سے شوق ہے چنانچہ انہوں نے نامور ان اٹلی میں دو کی سوانح عمریاں لکھی ہیں اس لئے اٹلی پر مضمون لکھنے اور وہاں کے واقعات سے سبق دینے والے نتائج نکالنے کا انہیں خاص حق ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ یہ مضمون نہایت شوق سے پڑھا جائیگا۔

یورپین ممالک میں اگر کوئی ملک ایسا ہے جو آب و ہوا اور اپنے باشندوں کے عادات و خصائل میں ہمارے وطن سے بمقابلہ دیگر ممالک کے زیادہ مشابہت رکھتا ہے تو وہ ملک اطالیہ ہے۔ ہندوستان اور اطالیہ کے نقشوں کے مقابلہ کرنے سے معلوم ہو جائیگا کہ شکل وصورت میں ابھی دونو ملک بہت کچھ ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ہندوستان بہت بڑا ہے جس میں آبادی ۳۰ کروڑ کے قریب ہے اور اٹلی بہت چھوٹا ہے جس کی آبادی محض ۳۶ لاکھ کے قریب ہے۔ خالق کائنات نے دونو کو ایسی عالیشان اور ظاہرا ناقابل گذر چھتیں عنایت کی ہیں کہ اپنے اپنے براعظم میں بلندی اور خوبصورتی میں اپنا آپ ہی نظیر ہیں۔ ہندوستان کی چھت تو دنیا میں سب سے بلند اور لاثانی ہے۔ مگر اطالیہ کی چھت بھی یورپ میں سب سے اونچی اور بے نظیر ہے۔ ہندوستان کو بندھیاچل عین وسط میں مشرق سے مغرب کی جانب چیر تا ہے۔ اطالیہ کو کوہ اپی نائینس شمالاً جنوباً گذرتا ہوا دو

ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔

علاوہ ان قدرتی کششوں کے جو ہم کو اطالیہ اور اہل اطالیہ کی طرف کھینچتی ہیں یہ بھی باور ہے کہ شاید دُنیا میں کسی مُلک نے انسانی تماشا گاہ پر اس قدر کرڈیں نہیں لیں۔ اور اس قدر رنگ نہیں بدلے جیسے اطالیہ نے تاریخی تھیٹر پر جس قسم کے گوناگون سین اطالیہ نے دکھائے اور جیسے رنگا رنگ کے پردے اُس نے بدلے ہیں وہ سب اس درجہ پُرسبق۔ اور دلکش ہیں کہ پڑھا لکھا انسان بے اختیار اطالیہ کی طرف کھنچا کھنچا جاتا ہے۔ یہ وہ مُلک ہے جس نے دو بار انسانی تاریخ میں "ملکۂ جہان" (کوئین اف دی ورلڈ) کا خطاب حاصل کیا۔ ایک وقت تھا کہ دُنیا رومن سلطنت کا سکہ مانتی تھی اور چار دانگ عالم میں رومن رُعب داب رومن تلوار اور رومن حکومت کا زور شور تھا۔ سارا یورپ اور قریبًا سارا شرقی ایشیا اور کل شمالی افریقہ اہلِ روما کے باجگذار تھے۔

ان علاقوں میں کوئی سپاہ دار نہ تھا جس کو روما کے سپاہیوں نے پچھاڑا نہ ہو۔ کوئی تاجدار نہ تھا جس کو مطیع کر کے سرنگوں نہ کیا ہو۔ رومن شاہنشاہ کے تاج میں اتنے شاہی نگینیں تھے جو کسی سے شمار نہ ہو سکتے تھے۔ اُس کے چاکروں کی صف میں اتنے حکمران کمربستہ رہتے تھے کہ جنکی گنتی نہ ہو سکتی تھی۔ رُوم کے تخت پر ایسے بھی بادشاہ بیٹھ چکے ہیں جو گھوڑے پر سواری کرنے کے وقت دیگر مطیع شدہ فرمانروایان کے گردن پر پاؤں رکھ کر سوار ہوتے تھے۔ ایک وقت تھا کہ روما کی سلطنت جمہوری اپنے جوبن پر تھی۔ دُنیاوی جاہ و حشمت اور سلطنت میں دُور دراز علاقوں پر حکومت کرتی تھی اور اپنی رعایا کی آزادی کی حفاظت اور علم و فضل کی اشاعت و ترقی میں نامور تھی۔ اس کے بعد ایک زمانہ آیا کہ سلطنت کے گھمنڈ اور بادشاہت کے زعم اور تہذیب کی شیخی میں جو زیادتیاں روما اور اہلِ روما نے دُوسرے ممالک کے فرماں روایان اور رعایا پر کی تھیں اُنکا خمیازہ اُنکو اُٹھانا پڑا۔

اور باہمی خانہ جنگیوں اور گھر کے جھگڑوں اور لیڈروں کے حسد و نفاق و بغض و کینہ کی سزا پوری پوری بھگتنی پڑی۔ اور جو ابھی تھوڑا عرصہ پہلے زبر تھے وُہ زیر ہو گئے۔ اس عرصے میں اطالیہ (روم اطالیہ کا دار الخلافہ ہے) کئی دفعہ لوٹا گیا۔ اور جلایا گیا۔ سچ پوچھو تو انسانی غرور اور تکبر کی بھی حد ہے۔ جب کسی نے حد سے تجاوز کیا منہہ کے بل گرا۔ جس وقت اطالیہ اپنے تہذیب کے پروں پر پرواز کر رہا تھا اور دُنیا میں جو ناگفتہ بہ سامان عیش و عشرت میں اُن کی زوردار لہریں بہا دیتا تھا۔ اُسی وقت قدرت نے ایسا تھپیڑا لگایا کہ حضرات روما کو ساری تہذیب اور سارا عیش و طرب بھول گیا۔ اس کے بعد پھر ایک اور زمانہ آیا جب کہ روما نے ایک نیا بھیس بھرا۔ اور اس دفعہ دنیاوی تہذیب اور دنیاوی سلطنت کو چھوڑ کر دینی حکومت اور دینی اقتدار کا سوانگ رچا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب روما کا پوپ یورپ کے تخت و تاج بخشنے اور چھین لینے کے اختیار وسیع رکھتا تھا۔ کسی کو مجال نہ تھی کہ اُس کے فیصلے کے خلاف چون و چرا کرے۔ کسی کو جرأت نہ تھی کہ اُس کی حکم عدولی کرے۔ پوپ کی تحریر گویا تقدیر کا لکھا تھا۔ یورپ کی جملہ سلطنتیں روم کے نام سے کانپتی تھیں۔ سارا یورپ روم کے آواز کے نیچے تھا۔ تمام بادشاہی خزانے اور تمام افواج روم کی وضعداری اور اُس کے جلوس کی رونق بڑھانے کے لئے ہر وقت موجود تھیں۔ یہ وُہ شان تھی کہ ایک دفعہ تو انسان کا دل ہلا دیتی تھی۔ یہ وُہ اقتدار تھا کہ جس کے سامنے نہ کسی بادشاہ کی مجال تھی اور نہ کسی رعایا کو سر ہلانے کی گنجائش۔ آخر اس کا بھی انجام آ پہنچا اور جرمن میں ایک غریب سے مُلّا (مارٹن لیوتھر) نے جھنجلا کر اس طرح حضرت پوپ کی عالیشان عمارت کو ہلا دیا کہ بنیادوں تک جنبش کھا گئیں۔ پوپ کے دینی رُعب داب کا کم ہونا تھا کہ اطالیہ کا پولیٹکل آفتاب بھی مدھم پڑ گیا۔ اور آخری نتیجہ یہ ہوا کہ ارد گرد کی طاقتوں نے موقعہ پا کر ملک کے مختلف حصے دبا لئے اور اپنے اپنے

بھائی بندوں کو سونپ کر ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

ایک چھوٹا سا ملک اور اُس میں کئی شاہی خاندان حکومت کرنے لگے۔ جنوبی حصہ سسلی کا تخت علیحدہ نیپلز کا علیحدہ۔ ٹسکنی کا علیحدہ۔ پیڈمانٹ کا جُدا۔ فلارنس کا جُدا۔ ان سب کے علاوہ خاص روم میں حضرت پوپ علیحدہ اپنی ڈھائی چاول کی کھچڑی پکاتے رہے۔ طرفہ یہ کہ یہ مختلف حصص مختلف طاقتوں کے زیرسایہ تھے۔ بعض فرانس کے۔ بعض آسٹریا کے بعض اسپین کے اور بعض خود مختار۔ ایسی حالت میں رعایا کی جو حالت ہو سکتی ہے اور ہوئی اُس کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہمارے ہموطنوں کو ان سب حالتوں کا اسقدر تجربہ ہے کہ یقیناً اُن کے سامنے اُس ذلّت و نکبت کا نقشہ کھینچنے کی ضرورت نہیں۔ جو ایسی صورت میں محکوم رعایا کے لاحق حال ہوتی ہے۔ آخر قدرت نے پھر ایک پلٹا دینے کی ضرورت محسوس کی۔ اور اہلِ ملک مختلف فرمان روایان کے مابین باقاعدہ شطرنج کی بازی جم گئی۔ طرفین سے کشت پر کشت پڑنے لگیں۔ کئی دفعہ بازی ختم ہونے کو آئی مگر آخر حکمران حضرات کو کوئی نہ کوئی راستہ ملتا رہا جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ یہ بازی بہت مُدّت تک لگی رہی۔ رعایا نے علانیہ خُفیہ مختلف طریقوں سے آزادی حاصل کرنے کے لئے بہت جدوجہد کی۔ اُدھر حکمران فرمان روایان نے اپنی طاقت و حکومت کے برقرار رکھنے میں کوئی کوشش اُٹھا نہیں رکھی۔ قریباً ایک صدی تک یہ نقشہ جما رہا۔ ملک میں کتنی ہی خفیہ سوسائٹیاں قائم ہوگئیں۔ اہلِ قلم نے اپنی جودت طبع آزادی کے خیالات کی اشاعت میں صرف کی شاعروں نے بھی ملک کو اُبھارنے اور طبیعتوں کو جوش دینے کے لئے دیگر ہمدردانِ ملک کا ہاتھ بٹایا۔ حتّٰی کہ جون ۱۸۰۵ء میں اطالیہ کے ایک اکٹر کی چاہتی خاتون نے ایک بچہ جنا جس کے ماتھے پر اطالیہ اتفاق اور اطالیہ کی آزادی کے نقش پلے گئے۔ یہ شخص جوزف میزینی تھا جس کو اٹالین اتفاق کا پیغمبر اور اٹالین آزادی کا رسُول کیا جاتا ہے۔ ہمارا یہ منشا نہیں

ہے کہ ہم اس وقت اس شخص کی زندگی کے واقعات قلمبند کریں۔ گو ہمیں یقین ہے کہ وہ حالات نہائت دلچسپ اور پُر معنے ہیں۔ تاہم اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس شخص کی تعلیم و تلقین اور اس کی فنافی القوم زندگی نے اطالیہ کے پولٹیکل شطرنج کا نقشہ بدل دیا۔ اس شخص کا جوان ہونا تھا کہ کھیل گرم ہو گیا اور چاروں طرف سے "انقلاب" "انقلاب" کے آواز آنے لگے۔ چاروں طرف سے زبانی تحریک و تحریری کوشش کی امداد میں ہتھیار چلنے شروع ہو گئے۔ یہ تمام کوششیں شاید بارآور نہ ہوتیں اگر خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ایک جوانمرد جس نے میزینی کی شاگردی میں اٹالین اتفاق اور اٹالین آزادی کی تعلیم پائی تھی۔ اہل اطالیہ کی سرداری کے لئے کھڑا نہ ہوتا۔ یہ سچ ہے کہ خداوند کریم ہمیشہ ضرورت کے وقت اپنے برگزیدہ بندوں میں سے کسی نہ کسی کو اپنی خلق کی امداد کے لئے بھیجتا رہتا ہے۔ یہ شخص جس نے اپنی تلوار اور اپنی دلیری اور جانبازی سے اہل اطالیہ کے بند کاٹے۔ اور غیر قوم کے حکمران خاندان کو نیچا دکھا کر مُلک سے باہر کر دیا۔ گیری بالڈی تھا جو آج اہل اطالیہ کا سب سے پیارا اور سب سے چاہتا ہیرو ہے۔ اگر یورپ میں کسی شخص نے تاج اور تخت چھین کر بخش دیئے اور ملک فتح کر کے دُوسرے کو دیدیئے تو وُہ گیری بالڈی تھا جس نے شاہ میلان کو اطالیہ کا بادشاہ بنایا اور سارے ملک میں قومی حکومت قائم کی۔ انصاف سے بعید ہوگا اگر ہم اس موقعہ پر اُس وزیر باتدبیر کا ذکر خیر نہ کریں۔ جس کی تدبیر و دانائی نے گیری بالڈی کی شجاعت کو پُوری کامیابی کا مُنہہ دکھایا۔

ہمارا اشارہ کونٹ کیور کی طرف ہے جو شاہ پیڈمانٹ کا وزیر اعظم تھا اور جس کے تمدن و تدبیر و حکمتِ عملی کا آج سارا یورپ قائل ہے۔ اس عقلمند بادشاہ (وکٹر ایمونیل) کی دانائی بھی کم سراہنے کے قابل نہیں ہے۔ گو ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان چاروں بزرگوں میں سے اوّل الذکر دو خاص عزت کے قابل ہیں کیونکہ زیادہ تر انقلاب کا بوجھ اُن پر پڑا۔ اُنھوں نے

سخت سے سخت مصائب کا مقابلہ کیا۔ اپنی جان جوکھوں میں ڈالی۔ مُدت تک جلا وطن رہے ناگفتنی عذاب اُٹھائیے۔ مگر وطن کی محبت اور آزادی کی چاہ میں کبھی کمی نہ آنے دی۔ آج اٹلی اور اہل اٹلی ان دونوں بزرگانِ قوم کے نام پر فدا ہیں۔ جگہ جگہ اُن کے بُت ایستادہ کئے گئے ہیں اور کئے جا رہے ہیں۔ جگہ جگہ ان کی یادگاریں بنائی گئیں ہیں اور بنائی جا رہی ہیں۔ شہر شہر میں گلی کوچے۔ چوک اور محلّے بازار اور گذرگاہیں اُن کے نام سے موسوم ہیں۔ روم میں سب سے بُلندی پر اور سب سے عُمدہ موقعہ پر گیری بالڈی کا بُت ہے جس کو اُستاد نے اسی طرح نصب کیا ہے کہ مرحوم جنرل کی نظر ہمیشہ پوپ کے محلات کی طرف رہتی ہے۔ جس سے کاریگر نے یہ ظاہر کیا کہ جب تک اہلِ مُلک پوپ کے محلات پر قابو نہیں پاتے اُن کو پُورا امن نصیب نہیں ہو سکتا۔

میلان میں جو اٹلی کے آزاد ہونے سے پہلے شاہ وکٹر ایمونیل کا دار السلطنت تھا کیوور کا بت ہے اٹلی میں روم۔ نیپلیز۔ میلان۔ جنوا اور فلارنس قابل دید شہر ہیں۔ اوّل الذکر شہر دار الخلافہ ہے۔ اس شہر میں ایک حصّہ جس میں پوپ کے محلات واقع ہیں۔ پوپ کے تسلّط میں ہے اور اس حصّے میں پوپ کو اختیارات کامل حاصل ہیں گویا ایک شہر میں دو بادشاہیاں ہیں۔ اس حصّے میں سینٹ پیٹر کا گرجا ہے جو ایک قدیم بُت خانے کی جگہ پر بنایا گیا ہے۔ اس گرجے کے سامنے دو بُت ایستادہ ہیں جن میں سے ایک سینٹ پیٹر کا اور دوسرا سینٹ پال کا ہے۔ اوّل الذکر کے ہاتھ میں بہشت کی کُنجی ہے اور آخر الذکر کے ہاتھ میں دین کی تلوار ہے۔ رُوم میں بہت بڑے بڑے عالیشان گرجے ہیں مگر سینٹ پیٹر کا گرجا خاص پوپ کا گرجا ہے اور اپنی شان آراستگی اور خوبصورتی میں دُنیا میں لاثانی ہے۔ پوپ کا مذہب کسی طرح بُت پرستوں سے مختلف نہیں ہے۔ ان گرجاؤں میں حضرتِ عیسیٰ۔ اُن کی والدہ مریم کے بُت اور حواریوں ولیوں اور شہیدوں کی قبریں اور اُن کے بُت پُوجے جاتے ہیں۔ اور ان پر چڑھاوے چڑھائے

جاتے ہیں۔ منتیں مانی جاتی ہیں۔ چراغ روشن کئے جاتے ہیں۔ دھوپ جلائی جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ بہت سے گرجے سابقہ مندروں کو گرا کر بنائے گئے ہیں۔ پرانے بت توڑ کر عیسائی تصاویر اور عیسائی بت رکھ دیئے گئے ہیں۔ اس شہر کا ہر ایک حصہ انسان کے لئے عبرت سے بھرا ہوا ہے۔ قدیم سلطنت روما کے آثار صنادید قدم قدم پر دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ میلوں تک زیر زمین مکانات، قبریں اور پرانے محل کھودے جا رہے ہیں اور پرانی عظمت اور تہذیب اور شان کو یاد دلا رہے ہیں۔ ان تہ زمین کھنڈرات میں جا کر بے اختیار خدا کی خدائی یاد آتی ہے اور سخت سے سخت منکرِ خدا کو بھی ایک پروردگار کی ہستی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ان کھنڈرات میں عیسائی پادری چراغوں کی روشنی میں لوگوں کو ابتدائی زمانہ کے عیسائیوں کے مکانات ان کی قبریں اور اُن کی عبادت گاہیں دکھاتے ہیں۔ اور یہ بتاتے ہیں کہ کس طرح وہ لوگ اپنے دین کی حفاظت میں اور اپنے ایمان کی خاطر شہید ہوئے۔ ہائے افسوس! ہر نئی عمارت کا بنانے والا یہ بھول جاتا ہے کہ اُس کی اپنی بنائی ہوئی عمارت کتنے بندگانِ خدا کی نعشوں پر کھڑی ہے۔ اور کتنوں کے خون سے تعمیر کی گئی ہے۔ اور جن ہاتوں کا وہ دوسروں کو جوابدہ ٹھہراتا ہے وہ اس سے خود بھی کس حد تک سرزد ہوئی ہیں۔

اٹلی میں دو زبردست آتش خیز پہاڑ ہیں:۔ کوہ اٹنا اور کوہ وسوویس۔ یہ دونوں خونخوار پہاڑ وقتاً فوقتاً اہل روما کے زعم کو توڑتے رہے ہیں۔ دو ہزار برس کے قریب عرصہ گذرا جب سلطنت روم اور رومن تہذیب اپنے جوبن پر تھیں اُسوقت ویسوویس نے خدا کے غضب کی شکل اختیار کی اور اٹلی کے ایک نہایت عظیم الشان شہر کو اپنی راکھ کے نیچے دفن کر دیا۔ لوگ بستروں سے اُٹھنے نہیں پائے تھے کہ شعلوں سے دب کر فنا ہو گئے۔ یہ مقام اب کھودا جا رہا ہے اور اُس میں سے عالیشان مکانات کے کھنڈرات۔ بت۔ مندر۔ سرکاری عمارتیں اور دیگر مختلف سامانِ معاشرت و تہذیب نکل رہے ہیں۔

ان کھنڈرات میں سے بعض نعشیں ایسی ملی ہیں جن کا جسم گو پتھرا گیا ہے مگر جن کے دانت اور ہڈیاں بجنسہٖ اصل شکل میں اب تک موجود ہیں۔

ایک موقعہ پر ایک ماں بیٹی سوئی ہوئی نکلیں۔ ایک دوسرے موقعہ پر عاشق اور معشوق ہمکنار نکلے۔ بہت سے جانوروں کے پنجر نکلے۔ ان کھنڈرات کو دیکھنے سے اور اُن میں سے جو اشیاء برآمد ہوئی ہیں اُن کا ملاحظہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے کی تہذیب پر اُس زمانے کے لوگوں کا ناز کرنا کیسا فضول ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا میں تہذیب ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگی۔ صرف تفاوت اس قدر ہے کہ یہ درخت جگہ بدلتا رہتا ہے ؞

لاجپت رائے

غزل

شفا سے کیا غرض اے چارہ گر بیمارِ جاناں کو
مجھے یہ درد ہی اچھا ہے رہنے دیجو درماں کو

جلایا ہے وہ خرمن آپ کی برقِ تبسّم نے
کہ حسرت جس پہ گرنے کی رہی ہر برقِ باراں کو

بلا کے مَن چلے مردانِ میدانِ جنوں دیکھو
کیا آباد جا کر کوہ کو صحرا کو زنداں کو

سیہ مستی ہے ان میں بھی ترے گیسوئے سرکش کی
کوئی دیکھے ترے سودائیانِ پابجولاں کو

اُدھر غایت عنایت کی اِدھر پایانِ مجبوری
دکھاؤں کس طرح صورت نگاہِ لطفِ جاناں کو

رہینگے دل کے دل میں یہ نہ نکلی ہیں نہ نکلیں گے
نہ ٹوکو میری حسرت کو نہ چھیڑو میرے ارماں کو

کوئی ایسا تو دل لیں جس کی قیمت آپ کا دل ہو
کرینگے آپ کیا اس ہرزہ دل کی جنسِ ارزاں کو

یہ نیرنگی ہے سب نیرنگ کی تقدیر کی ورنہ
ترے کوچے کے گلشن سے کوئی کیوں جائے گلشن کو

(نیرنگ)

فنِ شاعری

نمبر (۳)

واقف علیہ الرحمۃ

اے دل کہ زما پیش باین بزم رسیدی — بارے خبرے دہ کہ چہ گفتی چہ شنیدی
بستی خط اغیار چہ تعویذ ببازو — غم نامۂ ما بود کہ ناخواندہ دریدی
عمر تو دلا۔ در قفسِ سینہ بسر رفت — یک روز اسیرانہ صفیرے نکشیدی
اے اشک ترا فائدہ زیں قطرہ زدن چیست — بسیار دویدی و بجائے نرسیدی
بایست ترا زود دوید از پے آں طفل — از چشمِ من اے اشک چرا دیر چکیدی
صد بار نشستی بہ کمینِ دلِ ما حیف — تیرے نکشادی و کمانے نکشیدی
دل مے برد از ما چہ صباحت چہ ملاحت — در عشق ندانیم سیاہی و سپیدی
چوں شمع مرا سوخت درازئ شبِ ہجر — داغم ز تو اے صبح چرا دیر دمیدی
دیگر چہ فروشد بتو واقف کہ متاعش — دل بود کہ آں را تو بہ یک عشوہ خریدی

یہ دونوں غزلیں دو مشہور فارسی شاعروں کی ہیں۔ ان میں نہ تو اخلاق ہے۔ اور نہ مبالغہ[1]۔ اور مشکل پسندی۔ سادہ طرز اور روشن زمین میں کہی گئی ہیں۔ مگر باوجود اس سادگی

[1] تیسرا اعتراض یہ تھا۔ کہ ایشیائی شاعری میں مبالغہ ہوتا ہے۔ یہ اعتراض بھی تکلیف سے خالی نہیں۔ جہاں خالی واقعات اور خیالی کیفیات سے کام لیا جاوے۔ مبالغہ ضرور ہوگا۔ کیا ناولوں اور ڈراما میں مبالغہ نہیں ہوتا

کے بھی ان میں مناسب استعارات ہیں۔ اگر ایسے استعارات سے بھی طبیعت اُکتاتی اور دل کڑھتا ہے۔ تو پھر میں نہیں جانتا کہ نظم کی خوبی اور نفاست کیا ہوگی۔ شاعر ایک بڑے لمبے چوڑے واقعہ کی تلخیص اور ایک وسیع مضمون ایک شعر میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ خیالات میں جو تموّج اور جوش ہوتا ہے۔ اُسے ایک خاص دائرہ میں لاکر دکھانا اپنا فرض سمجھتا ہے ایسی حالت میں شاعر کس طرح ایک معمولی تکلیف سے بچ سکتا ہے۔ شعر کہنا یا کسی واقعہ اور خیال کا نظم کرنا اسواسطے بھی زیادہ مشکل ہے کہ طائرِ واقعات کا دامِ تلخیص میں بند کرنا۔ اور پھر معانی کا آئینہ وضاحت میں دکھانا خیلے مشکلے دارد۔ شعر اور نظم اگر نثر کے قالب میں لائی جائے۔ تو کیوں بھدی معلوم ہوتی ہو۔ اور کیوں دل سے اُتر جاتی ہے۔ اسواسطے کہ نہ تو وہ بندش اور تلخیص باقی رہتی ہے۔ اور نہ وہ طاقت جو اُس تلخیص میں بھری گئی تھی۔ شعر یا نظم در اصل چند واقعات یا حادثات یا کیفیات کا لُب یا ست ہوتی ہے۔ اگر ایک خاص مقدار کے لب یا ست میں وافر پانی ڈالا جاوے۔ تو اس کا وہ اثر اور وہ طاقت باقی نہیں رہیگی۔ اور اگر اس کے برعکس ایک شے کا ست لیا جاوے تو وہ بہ نسبت اپنے ابتدائی یا اصلی مقدار کے زیادہ تر قوی ہوگا۔ جب نثر یا عام طرز بیان کی شعری قالب میں تلخیص کی جاتی ہے۔ تو وہ بھی گویا اُس کا ایک لطیف ست یا لُب ہوتا ہو۔ اس میں نسبتاً طاقت زیادہ اور کشش قوی ہوتی ہو۔ نثر کا ایک صفحہ پڑھ دینے سے وُہ اثر نہیں ہوتا۔ جو ایک شعر سے

عہ: کیا فرضی داستانوں اور تذکروں میں اس سے کام نہیں لیا جاتا۔ کیا اثر ڈالنے کی غرض سے ایک معمولی واقعہ پُر درد الفاظ کے قالب میں ایک درد اور سوز سے ظاہر نہیں کیا جاتا۔ رندیہ نظموں اور عشقوں کے قصوں میں جو طرز اختیار کی جاتی ہو۔ کیا وہ مبالغہ سے خالی ہوتی ہے۔ مبالغہ دو قسم پر ہو۔ "مبالغہ فی الاصل" اور "مبالغہ فی الزوائد"۔ "مبالغہ فی الاصل" کی مثال ایسی ہی ہو۔ جیسے کوئی شاعر ایک واقعی حسین کی تعریف میں بوجہ اس کی ذاتی کشش اور دلربائی کے دلچسپ استعاروں اور موزوں فقرات اور چُست کلمات سے کام لے۔ یا ایک قدرتی منظر کی ذاتی

ہوتا ہے - سپیکر زاور واعظین جو اپنی اپنی سپیچ اور وعظ میں کبھی کبھی موثر اشعار پڑھتے - اور ضرب الامثال یا اقوال کا حوالہ دیتے ہیں - اُسکا موجب یہی ہوتا ہے - کہ وہ اپنے کلام کو اس مصالحہ سے موثر اور پُرمزہ بنانا چاہتے ہیں - اوپر کی غزل میں حضرت واقف علیہ الرحمۃ کہتے ہیں ؎ اے اشک

ترا فائدہ زیں قطرہ زدن چیست - بسیار دویدی و بجائے نرسیدی +

عام طبیعتیں اس منزل تک پہنچ کر رہ گئی ہونگی - کہ شیخ نور العین واقف اشک چشم سے مخاطب ہیں - نہیں نہیں یہ تو ایک تمثیلی اخلاقی سبق ہے - اگر اسے نثر کے قالب میں لایا جائے تو اس پر ایک علیحدہ عنوان سے ایک بسیط مضمون لکھا جا سکتا ہے - اس میں تمثیلاً اشک کی ہمت - جرأت اور کمال کا مذکور ہو کر یہ جتلایا گیا ہے - کہ باوجود اس تگ و دو کی منزل کچھ بھی طے نہ ہوئی - ایسی حرکت اور تگ و دو کا فائدہ ہی کیا - یہ شعر اُن لوگوں کے واسطے اخلاقی رنگ میں ایک تمثیلی تازیانہ ہے - جو باوجود کم ہمتی - کم بضاعتی اور کم لیاقتی کے اپنی حد سے باہر جاتے اور باہر قدم رکھتے ہیں - جب ایک مقرر یا لکچرار اس مضمون پر وعظ کہتا اور لکچر سُناتا ہے - تو یہ شعر نظیراً اپنے دعویٰ کی تائید اور توضیح میں پڑھ کر جو کچھ پہلے تفصیلاً کہا ہے - اسکو خلاصۃً پھر دُہرا سکتا ہے -

عمدگی کا اعلیٰ درجہ کی تمثیلات سے اظہار کرے - در اصل یہ مُبالغہ نہیں ہے بلکہ ایک شے کے ان اوصاف اور ان جذبات کی مکمل تشریح ہے - جس سے عوام الناس ناآشنا نہیں - ایک قدرتی منظر پر ہر ایک کی آنکھ پڑتی ہے - لیکن جب ایک بامذاق شاعر اُس کے اپنے مذاق کے مطابق تفصیل اور تشریح کرتا ہے - تو سامعین کو رُلاتا ہی نہیں - بلکہ اُن کے گوہر دل چھید چھید چھلنی کر دیتا اور ان کا سوز اندرونی جوش میں لاتا ہے - صدائے نے ہر کوئی سُنتا اور نے ہر کوئی دیکھتا ہے لیکن جس وقت ایک پُر درد شاعر اپنے رنگ میں صدائے نے اور نے کی حکایت سُناتا ہے - اُس وقت دلوں پر جو گذرتی ہے - اُسے دل ہی جانتے ہیں - نے کے دیکھنے سے وہ لطف اور وہ سوز نہیں ہوتا - جو نے کے بجانے یا سننے سے ہوتا ہے -

شاعری کا مُدعا .... وہ لوگ غلطی پر ہیں۔ جو شاعری کا کوئی مُدعا نہیں سمجھتے۔ شاعری ایک فن ہے اور ہر فن کا کوئی نہ کوئی مُدعا ہوتا ہے۔ وُہ لوگ بھی غلطی پر ہیں۔ جو شاعری کا مُدعا صرف یہ سمجھتے ہیں :-

"چند الفاظ کا بہ تقیدِ اوزان و بحور جمع کر لینا"۔

"چند واقعات اور کیفیات کی بندش یا تلخیص" یہ شاعری کے مُدعا نہیں ہیں یہ تو عوارض یا زوائد خاصہ ہیں۔ ہاں ایسے زوائد ہیں جن کے بغیر کالبدِ شاعری بھدا سا معلوم ہوتا ہے۔ بیشک اَلنَّاسُ بِاللِّبَاسِ لیکن جیسے نرے لباس اور فوق البھڑک پوشاک سے ہی انسانیت کا رتبہ نہیں ملتا۔ اِسی طرح محض اُن زوائد سے بھی شاعری کا مُدعا حاصل نہیں ہو سکتا۔ شاعر یا شاعری

یہ کیوں اسوجہ سے کہ نرے انسانی لبوں سے نکلا قصہ درد و سوز تلخیصاً پیش سامعین کرتی۔ اور اپنا فوری اثر اُن پر ڈالتی ہے۔ اسی طرح معمولی منظر اور ان جیت یا خشک واقعات اور کیفیات جب شاعر کے مذاق اور سوزِ دل سے تعلق پذیر ہو کر اُس کی پُر درد جادو بیان زبان سے معرض اظہار میں آتے ہیں۔ تو اُنکا اثر اُنکا سوز اُنکا جذب معمولی حالات سے کہیں زیادہ اور پُرجوش ہوتا ہے۔ سامعین کی طبیعت میں ایک اُمنگ شوق۔ ولولہ۔ آرزو پیدا ہوتی ہے اور انہیں اُن تفریحات کے مقدس دائرہ میں لیجاتی ہے۔ جو دماغی اور قلبی خوشی کا ایک حقیقی اور طبعی ذریعہ ہیں۔ یہ شاعر کی لطافت بیانی اور سحر اقعی کا ہی اثر ہے۔ کہ ایک خشک اور ان جیت واقعہ بحر سوز میں ڈوبا ہوا آبِ درد سے لبریز طبیعتوں میں فوری اثر جاتا اور دلوں کو رُلاتا ہے۔ اگر شاعر اپنے مذاق اور تصرفات سے کام نہ لے تو یہ حالت کیونکر پیدا ہو سکتی ہے ....

جب طبیعت یا کوئی شخص چند منتشر واقعات میں اپنے مذاق کے موافق تصرف کرتا ہے۔ تو اُسے ایک اختیار یا عقبا اختصار و ایجاز تشریح و تفصیل اشارہ و کنایہ۔ مجاز و استعارہ۔ تشبیہ و تلازمہ حاصل ہوتا ہے۔ بمصداق یجُوزُ للشاعر مالا یجوز لغیرہ یا تو اسے ایسے تصرف کے مناظر میں کتر بیونت کرنی پڑتی ہے۔ بیشک ایک مخمل کا تھان ایک قیمتی شے ہے۔ اُسے مقراض کیا ہاتھ ہی نہیں لگنا چاہئے لیکن اس حالت میں مخمل کا تھان کہاں تک عزت اور بار پا سکتا ہے اور اُسے

کا خاص مدعا یہ ہے کہ:-

ہماری قوتِ متخیلہ کو جوش و تحریک میں لا کر ہم پر ایسے جذبات کا افشا اور اظہار کرے۔ جس سے دنیا و مافیہا زندگی۔ خوشی۔ غم اور سوز کا عملی اصول معلوم کر سکے۔ قوتِ متخیلہ کی طنابیں ہمارے ہاتھ میں ہوں۔ اور ہم قوتِ متخیلہ کے ہاتھ میں۔ یہی شاعر اور شاعری کا مدعا ہے۔ اور یہی شاعری اور شاعر کی غرض جو شخص اور جو طبیعت اس اصول پر چلتی اور اُسے اپنا رہنما بناتی ہے۔ وُہی ہمیں

اُسے کیا فوقیت مل سکتی ہے۔ اُسی حالت میں فوقیت اور بار پائیگا۔ جب مقراض تدبیر اور سوزن تجویز سے کٹا اور سیا جائیگا۔ مناظر اور واقعات یا قدرتی کیفیات بھی ایک تہ دار تھان ہیں بیشک اس حالت میں بھی وہ خوبصورت اور دلربا ہیں مگر جب تک مقراض تخیل سے کٹے اور سوزن تالیف سے سیئے نہ جاویں۔ تب تک اُن میں اثر اور درد کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔ جو لوگ فن شاعری اور شاعر کو تصرفات سے بالکل ہی معطّل اور بے بہرہ رکھنا چاہتے ہیں۔ کیا انکی یہ مرضی ہے۔ کہ شاعر نرا ایک مؤلف ہی رہ جائے اور بمصداق ؎ چشمانِ تو زیر ابرو آنند دندانِ تو جملہ در دہان اند یہ ایک مضمون کی تالیف یا ایک ترکیب ہے۔ اس میں کوئی خوبی۔ اور کوئی لطافت یا نفاست سوائے اس کے نہیں ہے کہ ایک واقعہ کا ہو بہو اظہار کیا گیا ہے۔ اس کا اثر کسی طبیعت پر یا کسی سامع پر ایسا نہیں پڑ سکتا۔ جیسے ایک شعر یا ایک بیت یا نظم تابع مفہوم شاعری کے واسطے لازمی ہے۔ بہت لوگوں نے نظم اور شاعری ایک ہی سمجھ رکھی ہے۔ بیشک شاعری کے مفہوم میں نظم داخل ہے۔ لیکن نظم کے مفہوم میں شاعری داخل نہیں۔ نظم نام ہے۔ چند متفرق اور منتشر واقعات کی بندش اور ترکیب کا۔ ضروری نہیں۔ کہ اس میں لطافت شاعری بھی ہو۔ جیسے شعر بالا میں۔ لیکن شاعری یا شعر میں۔ بندش اور ترکیب ہی نہیں ہونی چاہئے۔ بلکہ اثر۔ جذب۔ جوش۔ سوز۔ درد۔ زورِ بیان کی بھی سخت ضرورت ہے۔ ان امور کے پیدا کرنے کے واسطے شاعر نظم پر ہی بس نہیں کر سکتا۔ بلکہ اُسے اپنا زورِ طبیعت اور جوشِ مذاق بھی دکھانا پڑتا ہے۔ شاعر مناظر و واقعات اور کیفیات و حادثات کا محل اپنے زورِ طبیعت سے اس وادی میں لیجاتا ہے۔ جو شاعری کی زمین وادیٔ سوز۔ وادیٔ درد اور وادیٔ جوش کو موسوم ہے۔ اس وادی میں پہنچکر اور لوگ ہی حیران نہیں ہوتے۔ بلکہ خود شاعر بھی ششدر رہ جاتا ہے۔ شاعر خود اُن کا

اور حقیقی شاعری کی تابع ہے۔ اور وہی الشعراء تلامیذ الرحمٰن کے زمرہ میں داخل ہے۔ صرف چند الفاظ یا کلمات کے جوڑ لینے یا ترکیب دے لینے سے کوئی شخص اور کوئی طبیعت حقیقی معنوں میں شاعر نہیں بن سکتی۔ ہاں ناظم واقعات یا مرتب واقعات کہہ لو تو کہہ لو۔

اپنا ہی شعر مکرر سہ کرر پڑھنا اور جھوم جھوم مزے لینا اس امر کی زندہ دلیل ہے۔ کہ خود شاعر بھی بندش لطیف اور تلخیص نفیس سے سوز درد میں آجاتا ہے۔ اسکی طبیعت پر بھی وہی اثر ہوتا ہے۔ جو سامعین پر۔ جس طرح ایک اچھا نشانچی نشانہ بہدف دیکھ کر اچھلتا خوش ہوتا اور اپنے فن پر ناز کرتا ہے۔ ایسے ہی ایک شاعر بھی اپنی طبع خداداد کے زور پر فخر اور ناز کرتا ہے۔ یہ بھی اعتراض بعض اوقات کیا جاتا ہے۔

"ایشیائی شاعر اکثر اپنی تعریف آپ کرتے ہیں"

"عموماً شاعری کے مذاق میں خود تعریفی داخل ہے"

اخلاقی کتابوں میں بیشک یہ بتلایا گیا ہے۔ کہ خود تعریفی اچھا رویہ نہیں۔ جو شخص اپنی تعریف آپ کرتا ہے۔ وہ اخلاقی قیود سے باہر جاتا ہے۔ لیکن اس کا یہ منشا نہیں ہو سکتا۔ کہ ایک لائق شاعر یا ایک لائق سائنس دان اپنے معلومات یا طاقت اور زور معلومات کا اظہار بھی نہ کرے۔ جو شخص ایک فن میں ماہر ہے۔ وہ ضرور یہ کہنے کا حق رکھتا ہے۔ کہ میں اس فن میں ماہر ہوں۔ وہ اپنی لیاقت کے اظہار سے کبھی بھی شرم نہیں کرتا۔ ایک انگریزی مصنف کا قول ہے کہ "لیاقت اور شرمیلا پن دو متضاد چیزیں ہیں"۔ ایک عربی مصنف کہتا ہے کہ "وہی لوگ زیادہ شرمیلے ہوتے ہیں۔ جو نالائق ہیں"۔ ایک اور حکیم کا یہ قول ہے کہ "گدا کر شرمیلے ہوتے ہیں"۔

جو لوگ صاحب دماغ اور صاحب فطنت ہیں۔ وہ اپنی لیاقت کا اظہار اور اعتراف بھی کرتے ہیں۔ اور دوسروں کی لیاقت کے بھی بخوشی معترف ہوتے ہیں۔ لیکن جو شخص خود لائق نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ اسی فکر میں رہتا ہے کہ لائق جماعت کے لوگ زمانے میں باقی نہ رہیں۔ یا انکی شہرت پر حرف آئے۔ وہ دوسروں کی لیاقت سے جلتا اور کڑھتا ہے اور کہتا ہے۔ کہ اگر ایسے لوگ زندہ رہیں۔ تو ہمیشہ کے لئے خاموش اور دم بخود

واقعات اور کیفیات کا نظم کر لینا مشکل نہیں۔ شاعری مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ مشہور شاعروں کا کلام کچھ حصّہ تو نظم کا رکھتا ہے اور کچھ شاعری کے مذاق میں غرق۔ ساری غزل ہی منتخب نہیں ہوتی۔ چوٹی کا شعر کوئی ہی ہوتا ہے۔ گو ایسے شاعروں کی تمام نظمیں اور ابیات دائرۂ شاعری میں داخل ہوتی ہیں۔ لیکن اُن میں سے چندے شعروں کے سر پر تاجِ امتیاز رکھا جاتا ہے۔ اِنتخاب اور یاضتوں کی بنیاد اسی وجہ سے پڑی ہے۔ کہ شاعروں کے چیدہ کلام اُن میں زیبِ اندراج پاتے ہیں۔ چند بیتوں کی غزل میں سے اگر ایک بیت ہی چوٹی کا نکل آئے۔ تو ساری

تو ضرور رہیں۔ یا اپنی عظمت اور لیاقت کا اظہار نکریں۔ روشنی روشنی میں مل جاتی ہے۔ لیکن ظلمت سے روشنی جُدا اور الگ رہتی ہے۔ لیاقت اور جہالت میں بھی روشنی اور ظلمت سا فرق اور امتیاز ہے۔ جس طرح روشنی ظلمت سے علیحدہ رہتی ہے اسی طرح لیاقت بھی جہالت سے الگ رہتی ہے۔ شرم و حیا بیشک ایک اچھی صفت ہے۔ لیکن وہ شرم و حیا جو تابع جہالت رہتی ہے ایک بُرا خاصہ ہے۔ اس خاصے سے انسان امتیازات کے حاصل کرنے سے رُکا رہتا ہے۔ لوگ شرمیلاپن کی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن اسی تعریف کے شوق میں بسا اوقات۔ اکثر اشخاص اور بالخصوص ہونہار بچوں کی جودت طبع اور زورِ فطنت اور ملکہ لیاقت دبا دیا جاتا ہے۔ یہ وہ نقص ہے۔ جو بہت سے لائق لوگوں یا ہونہار اور ذہین بچوں کو ہمیشہ کے لئے نکما بنا دیتا ہے ..... مسٹر ہربٹ سپنسر نے اس کے متعلق اپنی کتاب تعلیم میں ایک دلچسپ بحث کی اور نظائر سے ثابت کیا ہے کہ صدہا ذہین اور ہونہار بچے شرمیلا بنانے کی دھن میں بے حس و حرکت کر دئے جاتے ہیں۔ اور انکا وہ مادہ دبا دیا جاتا ہے جو مخزنِ لیاقت ہے۔ جو ایک بچہ شرم کے مارے بات تک نہیں کرتا۔ اور مُنہ نیچے ڈالے اِدھر اُدھر بھاگتا ہے تو اسکی تعریف کیجاتی اور اُسے رغبت دلائی جاتی ہے۔ کہ اسی روشنی پر قائم رہے۔ طبیعت پر یہ ایک دباؤ اور مزاحمت ہے جسے اگر ایک شگوفہ پھوٹتے ہی دبا دیا جائے۔ تو وہ وہیں کا وہیں رہ کر خشک ہو جائیگا۔ ایسے ہی اکثر بچوں کی طبیعتیں اس عمل سے بند پڑ جاتی ہیں۔ شرم اسی حد تک محمود اور سود مند ہے۔ جو شرہ ادب اور دائرہ حیا کے اندر اندر ہو۔ اس سے پیچھے رہنا طبیعت کو غبی اور کُند کر دیتا ہے۔ مبالغہ فی الزوائد میں وہ تمام کیفیات

غزل ہی مرصع ہو جاتی ہے۔

شاعروں کے مدارج ۔ جس طرح ہر علم اور ہر فن کے اندرونی درجے اور نمبر ہیں اسی طرح شاعری یا شاعروں کے بھی درجے اور نمبر ہیں۔ ہر درجہ اور ہر نمبر میں مقابلتاً امتیاز اور فرق ہے۔ چونکہ مذاقِ طبائع میں اختلاف اور فرق ہے۔ اس واسطے ضروری ہے کہ نمبروں یا درجوں میں بھی گونہ فرق ہو۔ شاعروں کے بڑے بڑے درجے یہ ہو سکتے ہیں۔

(الف) "طبعی یا وہبی شاعر" (ب) "اکتسابی شاعر"

ان دونوں قسموں کے تابع اور قسمیں بھی ہیں۔ بعض شاعروں میں آمد زیادہ ہوتی ہے۔ اور

اور تمام حواشی شامل ہیں۔ جو محض اس غرض سے معرضِ بیان میں لائے جاتے ہیں۔ کہ سامعین کے دلوں پر ایک حیرت نما اثر ڈالا جاوے اور واقعات میں ایک غیر معمولی عمدگی خوبی یا زشتی۔ وحشت یا بھدا پن دکھایا جاوے۔ ایسے طور پر جو یا مبالغہ کیا جاوے۔ جو ایک معمولی واقعہ کی وسعت بڑے واقعہ سے ٹکر کھا سکے۔ اس قسم کے مبالغے بیشک داستانوں اور تذکروں میں ہوتے ہیں۔ اور حق یہ ہے۔ کہ ایشیائی طبائع میں اکثر زیادہ تر سواد پایا جاتا ہے۔ اور یہ صرف نظم اور شاعری میں ہی نہیں۔ بلکہ نثر میں بھی موجود ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ ایشیائی شاعری کا سارا سرمایہ ہی اسی رنگ سے رنگا ہوا ہے۔ بجائے خود ایک مبالغہ ہے۔ جو لوگ اُن نظموں اور اُن تصنیفات سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں جو ایک شاعر کے اپنے خاص مذاق میں کہی گئی یا منظوم ہوئی ہیں۔ وہ صحیح رائے قائم نہیں کر سکے۔ ایک خاص مذاق میں جب کبھی واقعات کی تفصیل اور تنقید کیجاتی ہے۔ تو وہ مبالغہ نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک خاص طرزِ بیان یا طرزِ تحریر۔ مثلاً ایک صوفی منش جب چند صوفیانہ واقعات اور کیفیات کی اپنے مذاق کے مطابق تشریح کرتا ہے۔ تو اس میں وہ اپنی خاص اصطلاحات کا استعمال کرتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں۔ کہ وہ مبالغہ کر رہا ہے۔ مبالغہ اور تشبیہ میں فرق ہے۔ بعض وقت ایک شاعر ایک مفہوم بذریعہ ایک تشبیہ کے ظاہر کرتا ہے۔ لوگ اُسے مبالغہ سمجھتے ہیں۔ اگر ایک شاعر بعض اوقات ایک شخص کے لئے جادو نظر یا جادو چشم استعمال کرتا ہے۔ تو اس کا ایسا استعمال محض اس

بعض آورد سے کام نکالتے ہیں۔ بعض قدرتی اُمور کی جانب زیادہ توجہ رکھتے ہیں۔ اور بعض خیالی اور فرضی پہلو بہت لیتے ہیں۔ بعض سادگی پسند ہوتے ہیں اور بعض اغلاق پسند۔ بعض مشکل مضامین سے نکل جاتے ہیں۔ اور بعض مشکل پسند نہیں ہوتے۔ بعض ظواہر بین ہوتے ہیں اور بعض باریک بین۔

طبائع باعتبار تزکیہ اور صفائی مختلف درجے رکھتی ہیں۔ جتنی کسی شاعر کی طبیعت مزکّی اور صاف ہوگی۔ اتنی ہی اس میں طاقتِ تصرّف اور زور اخذ ہوگا۔ وُہ اپنی شاعری کو انکتہ چینی کی نگاہوں سے دیکھیگا۔ اور دُوسرے شاعروں پر تنقیدی نظر ڈالیگا۔ جن نگاہوں سے وُہ اپنی تصویر دیکھتا ہے۔ اُنہیں سے دُوسروں کی تصویر بھی اس میں ایک امتیازی رُوح پیدا

نیت سے نہیں ہوتا۔ کہ اس شخص کی آنکھ سچ مچ ہی جادو بھری ہے۔ بلکہ اس کا ایسا اطلاق اس اعتبار سے ہے۔ کہ اس کی آنکھ میں ایک قسم کی کشش اور جذب پایا جاتا ہے اور یہ بالکل درست ہے۔ کچھ شک نہیں۔ کہ زلف وگیسو کے مبالغہ دار دیوانگی نے اس مبالغہ کی گرم بازاری میں بہت کچھ حصّہ لیا ہے۔ اور اکثر شاعروں کی شاعری ظلمت گیسو اور پیچیدگی زلف میں ہی رہ کر نزاکت کھو بیٹھی ہے۔ اور سوائے اس ہائے ہُو کے اس میں اور کوئی نفاست اور لطافت دکھائی نہیں دیتی۔ مگر اس وحشت اور جنون گیسو سے اکثر شاعروں کی شاعری منجھے اور پاک صاف بھی ہے۔ اور اگر کہیں کہیں انکی منظومات میں بھی اس قسم کے اشارے پائے جاتے ہیں۔ تو اس کا بہت سا حصّہ اخلاقی حکیمانہ۔ صُوفیانہ۔ عالمانہ بھی ہے۔ کیا یورپین شاعری اس نقص سے خالی اور منزّہ و مبرّا ہے۔ مَیں تو کہوں گا۔ کہ ایشیائی شاعری کی یورپین ہمشیرہ بھی ان نقصوں اور اعتراضات سے بالکل خالی نہیں۔ صرف فرق یہ ہے۔ کہ ہمارے ہاں نزاکت پسندی اور مُبالغہ کا کوئی اور معیار ہے۔ اور یورپ میں کچھ اور۔ یہاں زلف وگیسوئے۔ خال ودندان و دہن تنگ مشق رہ کر نقطۂ کمال قرار پائے

ہو جاتی ہے۔ وُہ ہمیشہ مضامین اور کیفیات کا انتخاب بہ نظرِ امتیاز کرتا ہو۔ جیسے شاعروں کے درجے اور نمبر ہوتے ہیں۔ ایسے ہی اُنکی شاعری کے درجے ہوتے ہیں۔

ہر شاعر کا مذاقِ طبیعت بادنیٰ تعمق ظاہر کرسکتا ہو۔ کہ اُس کا مقابلتًا درجہ کیا ہے۔ ممکن ہو کہ ایک شاعر کا مذاق دُوسرے شاعر کے مذاق سے مماثل ہو۔ لیکن ہُوبہُو اُس کا رنگ پایا جانا ذرا مشکل ہے۔ بہتوں نے اپنے مذاقِ طبیعت کو دُوسروں کے رنگ میں رنگا۔ مگر آخر کار وہ کھل ہی گیا۔ شاگرد اور اُستاد کے رنگِ طبیعت یا رنگ مذاق میں کچھ نہ کچھ مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر نہ اس قدر کہ دونوں کا طبعی رنگ بالکل ہی مفقود ہو جائے۔　　(باقی دارد)

سُلطان احمد (میانوالی پنجاب)

ہیں۔ اور وہاں صباحت و ملاحت اور قدرتی منظر مرکزِ اوج سمجھے گئے۔

باوجود اس تاویل کے بھی مَیں اس اصُول کا حامی ہُوں۔ کہ ہماری شاعری میں اور بھی سادگی لطافت۔ نفاست۔ اور درد و سوز ہونا چاہئے۔ اگر کوئی مواد مختلط ہے۔ تو وہ باہر نکال پھینک دیا جاوے۔ اگرچہ درمبالغہ سے اس کی خُوبصورتی۔ حُسنِ خداداد۔ اپنے حقیقی مرکز سے ہٹ کر چھپ جاتی ہے۔ تو اُسے نورِ سادگی۔ نورِ لطافت سے منور بنانے کی کوشش کیجاوے۔

یوروپین شاعری کے کمالات اور دلچسپیوں کا فارسی یا اُردو شاعری میں منتقل کرنا کسی بُرائی یا قباحت کا موجب نہیں ہر عُمدگی اور ہر دلچسپی (خواہ اُس کا مخزن کوئی ہی ہو) اس قابل ہے کہ وُہ حاصل کی جاوے۔ خُذ ما صفا و دع ما کدر۔

یتیم

خدا کی ذات بھی بڑی بے نیاز ہے۔ قدرت کے اسرار سے کون واقف ہے بقاءِ عالم کے جو مقرری سامان ہیں بعض اوقات اُن میں سے کسی میں ایسا انقلاب واقع ہوتا ہے کہ انسان ضعیف البنیان کلیجہ پکڑ کے بیٹھ جاتا ہے۔ مگر دم نہیں مار سکتا۔ گھر ویران ہو جاتے ہیں۔ خاندان تباہ ہو جاتے ہیں۔ مگر سوائے صبر اور شکر کے کیا چارہ ہے۔ نظامِ زندگی میں یہ بات کس قدر پُر بہار ہے کہ لڑکا کہیں پلا۔ لڑکی کہیں پلی۔ پلے اور جوان ہوئے۔ جوان ہوئے۔ اور بڑے چاؤ سے شادی ہوئی۔ اوّل اوّل نئی زندگی کا لطف اُٹھایا۔ پھر خانہ داری اور بچے پالنے کے فرائض نے ساری توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ اولاد۔ ماں باپ دونوں کی آنکھ کا تارا ہے۔ بچہ ضد کرتا ہے۔ ماں باپ سہتے ہیں۔ اپنا پیٹ کاٹتے ہیں۔ پھٹا پُرانا پہنتے ہیں۔ مگر اُس کو اچھے سے اچھا کھلاتے ہیں اور اچھے سے اچھا پہناتے ہیں۔ اور یہ سب اُس ممتا کے جوش میں ہوتا ہے۔ جو فطری طور پر اُن کے دلوں میں ودیعت کی گئی ہے۔ اللہ کے کارخانے دیکھو۔ یہ جوش اُن میں نہ ہوتا تو اس بیکسی کے زمانے میں کون پرورش کرتا۔ یہ سلسلہ یُوں ہی چلا آیا ہے اور یُوں ہی چلا جائیگا مگر کبھی کبھی یہ سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے اور قلبِ انسان ایک عظیم الشان انقلاب محسوس کرتا ہے۔ ہمیں اس وقت دو بھائی بہنوں کے خیالات لکھنے ہیں جو یتیم ہو گئے ہیں۔ کچی عمریں ہیں۔ مگر کچھ کچھ سمجھ آچلی ہے۔ دُکھیاری ماں جس پر برس روز ہوئے۔ یہ پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے اپنے سارے وقت کو۔ اس وقت کو جو رونے دھونے اور بے باپ کے بچوں کو دیکھ دیکھ کر کُڑھنے سے بچتا ہے۔ محنت مزدوری اور دُکھڑا کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ پالنے میں لگاتی ہے

پھر بھی وُہ بات نہیں پیدا کر سکتی - جو اُس بندھی ہُوئی آمدنی میں میسّر تھی - عزیز و اقارب اپنے اپنے مخمصوں میں لگے ہُوئے ہیں - دُوسرے اس نفسانفسی کے زمانے میں کون کسی کی مدد کرتا ہے - لوگوں کے نفس دن بدن موٹے ہوتے جاتے ہیں - اور بیکسوں پر رحم کرنیکا مادہ روز بروز کم ہوتا جاتا ہے - اَے فطرتِ انسانی ! تو بعض وقت کس قدر ظلم کرتی ہے ! پڑوس میں فاقہ ہو اور ہم پلاؤ زردہ کھا رہے ہیں - یتیم بچّے پھٹے حال اور ہم زرق برق پوشاک پہنے پھرتے ہیں - یہ جائز ہے ؟ آہ - آہ - دِل پتھر ہیں - اب یہ بیکس بیوہ کوئی دو ہفتے سے اس فکر میں لگی ہوئی ہے کہ عید کو بچّوں کے پاس نئے کپڑے ہو جائیں - دو چار آنے سودا کھانے اور کھلونوں کے واسطے بھی اُن کے پاس ہوں - اپنے رنڈاپے کے غم کو بھول گئی ہے اور دن رات اسی فکر میں ہے - عید آگئی ہے اور سب کام ادھورے ہیں - لاکھ جتن کئے مگر بچّے کے پاس نئی جوتی نہ ہو سکی - لڑکی کی اوڑھنی تو سنور گئی - مگر نیا کُرتہ نہ میسّر آیا - بچّوں کو دیکھتی ہے اور روتی ہے دو دو پیسے بڑی مُشکل سے دونوں کو دئیے ہیں - مگر دل خوش نہیں ہے - آنکھوں میں آنسو بھرے ہُوئے ہیں - سویاں پکائی ہیں - مگر کیا تینوں کا پیٹ بھر جائیگا - پہلی عید کو تو وُہ بیمار تھے - بچّے کو بُڈھے نانا کے ساتھ عید گاہ بھیجدیا تھا - اب کے نہ باپ ہے نہ بڈھا نانا - بچّہ کس کے ساتھ جائے - دِن بھر آپ روئے اور بچّوں کو رُلائے - بس یہی کرے - خیر یہ دقّت خُدا نے رفع کر دی - پڑوسن کے میاں اپنے بچّوں کے ساتھ رحیم کو بھی لے گئے - بیچارے خود غریب تھے اور کنبہ ساتھ تھا - پھر بھی دو ڈھائی آنے کے کھلونے - ترکاری اور کچوریاں اسے بھی لا دیں - بھائی جزاک اللہ ! وہ در دُنیا و ستّر در آخرت - تُم خدا کی نگاہ میں اُن امیروں سے لاکھ درجہ بہتر ہو جن کی کمائی میں حرامکاریوں کے لئے تو سینکڑوں ہزاروں روپے موجود ہیں مگر رانڈوں - یتیموں - محتاجوں اور بیکسوں کے حق کا ایک پیسہ بھی نہیں - کیا ظلم ہے ! اے بُردبار خدا - تو سہتا ہے مگر انسان نہیں سہہ سکتا - نصیبن کی اس آواز نے کہ "امّاں بھائی

کھلونے لائے" بدنصیب کے کلیجے میں گھونسا مارا مگر وہ بچوں کی خوشی میں کھنڈت نہیں ڈالتی اور جو چیزیں رحیم لایا ہے اُن کے حصّے کر دیتی ہے۔ بچّے کھاتے ہیں اور کھیلتے ہیں۔ یہ سین ختم ہو جاتا ہے۔ تو برف والے کی آواز رحیم کو جو نصیبن سے ڈیوڑھی میں کھیل رہا ہے۔ بیچین کر دیتی ہے وُہ پوچھتی ہے بھائی برف دلوا دوگے؟ ماں نے پہلے ہی کہدیا تھا کہ یہی وُہ دو پیسے ہیں۔ چاہے بڑے لینا چاہے بیر اور گنڈیریاں کھانا۔ پیسے پیسے والی دو قفلیاں لے لیں۔ اور دو پیسے بڑوں کے لئے رہنے دیئے۔ رحیم اُداس ہونے لگا۔ ابّا یاد آ رہے ہیں۔ زمین پر تنکے سے کیڑے مکوڑے بنا رہا ہے اور نصیبن سے یُوں باتیں کر رہا ہے۔ "ابّا ہوتے تو آج مٹھائیاں۔ اور سودے خوب کھلاتے۔ اَوروں کے تو سب کے ابّا ہیں۔ ہمارے ہی ابّا مر گئے۔ امّاں بھی تو اسی لئے صُبح سے کئی دفعہ رو چکی ہیں۔ تُو تو یہیں تھی عید گاہ میں سب بچّے اپنے اپنے اباؤں کے ساتھ تھے۔ وُہ انہیں جو مانگتے تھے دلوا دیتے تھے۔ بیچاری امّاں گوکھرو بُنتی ہیں۔ تو کارخانہ دار پیسے دیتا ہے اُس کا آٹا آتا ہے۔ ابّا تو اکٹھا لے آیا کرتے تھے"۔

نصیبن۔ "بھائی یہ کیا بات ہے کہ اَوروں کے تو سب کے ابّا جیتے ہیں۔ ہمارے ابّا کیوں مر گئے"۔

بھائی۔ "تو بھی دیوانی ہے۔ اللہ کی مرضی۔ امّاں کہا نہیں کرتی ہیں کہ جسکی موت آتی ہے وُہ مر جاتا ہے"۔

نصیبن۔ "اور بچّوں کو یُوں ہی چھوڑ جاتا ہے۔ کسی سے کہہ بھی نہیں جاتا کہ انہیں کھلا دیا کرنا"۔

بھائی۔ "وُہ کس سے کہہ جائے اور اُس کی کوئی مانتے ہی کیوں لگا۔ ابّا نے ماموں سے اتنا کہہ دیا تھا۔ کہ وُہ ہمیں چھوڑ کر بمبئی چلے گئے۔ خیر خبر تک تو بھیجتے ہی نہیں۔ ہمارا کوئی چچا ہوتا یا پھوپھی یا دادا دادی ہوتے تو وُہ ضرور ہماری خبر لیتے۔ اب تو ہماری امّاں ہیں سو محنت کر کے ہم سب کا پیٹ پالتی ہیں"۔

نصیبن۔ "تو امّاں یُوں ہی گوکھرو بُنا کرینگی اور ہمیں کھلایا کرینگی"۔

بھائی۔ "نہیں۔ اب برس دو برس میں مَیں اور بڑا ہو جاؤنگا۔ کارخانہ دار میرا بہنوئی

کردیگا وہ بھی اماں کو لادیا کرونگا۔ اِدھر تو بھی گو گھروسیکھ جائیگی۔ تیرے بھی پیسے آنے لگیں گے"۔

نصیبن۔ "تو پھر ہم تم بھی فضل اور سکینہ کے سے کپڑے پہننے لگیں گے۔ سکینہ کے تو ہاتھوں میں چوڑیاں بھی ہیں"۔

اتفاق دیکھو کہ ماں کسی کام کو ڈیوڑھی کی طرف آئی تھی۔ اُن کی باتیں کان لگاکر سُنیں دِل بھر آیا۔ بیتاب ہوکر دونوں بچوں کو چھاتی سے لگایا اور آپ بھی خوب روئی اور انہیں بھی رُلایا۔ لڑکے کی اس ہمت پر ڈھارس بندھی کہ یہ بھی کما کر لایا کریگا۔ اُسے لاکھوں دُعائیں دیں۔ اور ایک لمحہ کے لئے خاوند کے نہ ہونے کا غم بھول گئی۔ سچ ہے سعادتمند اولاد سے رانڈ ماؤں کا رنڈاپا کٹ جاتا ہے۔ دِل میں باغ باغ ہوتی ہے کہ برس چھ مہینے میں پانچ چھ آنے روز گھر میں آنے لگیں گے۔ خوب پیٹ ڈھلنے لگے گا۔ ہمیں اس بیکس رانڈ اور اِن یتیم بچّوں سے بہت ہمدردی ہے۔ خدا ان پر رحم کرے۔ ماں کو بچّوں کا سہارا ہے۔ اور بچّوں کو ماں کا۔ مگر ایک وہ رانڈیں بھی ہیں۔ جن کو تنکے کا بھی سہارا نہیں عمر کاٹنی مشکل ہوجاتی ہے۔ نہ گھر نہ در۔ ماماگری کرتی ہیں۔ پرائے بچّے کھلاتی ہیں اور رو دھوکر عمر گذار دیتی ہیں۔ آہ۔ آہ۔ ایک وہ بھی یتیم بچّے ہیں جنہوں نے نہ باپ دیکھا نہ ماں۔ نہ رہنے کو گھر۔ نہ کھانے کو روٹی۔ کون اُن کی پرورش کرے۔ کون اُن کا دِل ہاتھ میں لے۔ نواب۔ امیر۔ یہ کام کرتے مگر اُن کی آنکھوں پر چربی چھائی ہوئی ہے۔ اپنے عیش آرام سے کہاں فرصت۔ نہ مرنیکا ڈر ہے۔ نہ خُدا کے ہاں جانیکا خوف +

عزمی دہلوی

ایک سیب کا معاوضہ

شہنشاہ نورالدین جہانگیر کے عہد کا ذکر ہے کہ ضلع جھنگ میں ایک غریب کاشتکار رہتا تھا جس کے خاندان میں کئی آدمی تھے مگر آمدنی کافی نہ تھی اور اس وجہ سے نہایت عسرت کے ساتھ بسر ہوتی تھی۔ اتفاق سے کاشتکار کی حاملہ بیوی کا وضع حمل سے تین چار دن پہلے سیب کھانے کو جی چاہا۔ غریب کاشتکار نے عمر بھر سیب کی صورت بھی نہ دیکھی تھی لہذا تعمیل فرمائش سے قاصر رہا لیکن جب بیوی نے بیقرار ہو کر بہت مجبور کیا تو وہ گانوں کے نمبردار کے پاس گیا اور اس سے سیب کا طالب ہوا۔ نمبردار سیب کے لئے شہر کو آدمی بھیجنا ہی چاہتا تھا کہ ایک شخص نے کاشتکار سے کہا کہ اس گانوں کے قریب ایک بڑا سوداگر خیمہ زن ہے اور امید ہے کہ اس کے پاس سیب مل جاوے۔ کاشتکار بیچارہ یہ سنکر اس جانب روانہ ہوا اور خیمہ گاہ میں پہنچکر ہر شخص سے دریافت کرنا شروع کیا کہ سیب کہاں بکتے ہیں۔ اور جب کوئی سیب کی ضرورت دریافت کرتا تھا تو ہمارا مسکین کسان اپنی بیوی کی حالت بیان کر دیتا تھا۔ آخر لوگ اس کو سوداگر کے روبرو لے گئے جو اپنی خداداد ذہانت سے سمجھ گیا کہ اس عورت کا بیٹا جو وضع حمل کے قریب سیب کھانا چاہتی ہے کوئی عالی مرتبت شخص ہوگا اور عجب نہیں جو دربار شاہی کا کوئی بڑا عہدہ دار ہو جاوے۔ یہ خیال کر کے اس ملک التجار نے کاشتکار سے ایک اقرار نامے پر دستخط کرنے کو کہا جس میں لکھا تھا کہ مقرر کا لڑکا جب بڑا ہو کر دربار شاہی میں رسوخ حاصل کرے اور با اختیار ہووے تو وہ اس سوداگر کو محصول درآمد و برآمد مال کی ادائگی سے مستثنیٰ کر دے۔ اور اس سے کہا کہ اس کے معاوضہ میں وہ جس قدر سیب چاہے لے جاوے۔ غریب کسان نے نہ تو یہ پوچھا کہ اس اقرار نامے کا کیا مطلب ہے اور نہ وہ محصول درآمد و برآمد جانتا تھا بلکہ غریب نے جلدی سے اس کاغذ پر دستخط کی چند

لکیریں کھینچدیں اور ایک سیب لیکر گھر کو چلتا ہوا۔ اور بیوی کو جاکر دیدیا۔ یہ سیب کھانے کے تین چار روز بعد اُس کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام سعد اللہ رکھا گیا اور جو بعد کو علامی نواب سعد اللہ خاں کے نام سے مشہور ہوا۔

سعد اللہ جب کچھ بڑا ہوگیا تو معمول کے موافق جنگل میں مویشی چرایا کرتا تھا مگر چراگاہ میں وہ اپنی چادر بچھاکر بیٹھ جاتا تھا اور اس کے ساتھیوں میں جب کوئی جھگڑا ہوتا تو بادشاہ کی طرح اس کو فیصل کیا کرتا تھا۔ ایک دن جنگل میں ہی ایک بزرگ کے مزار کے قریب وہ چادر بچھاکر سوگیا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک بزرگ سبز پوش اس کے پاس آکر کھڑے ہوئے اور اُس کو دہلی جانے اور کسی مکتب میں داخل ہونے کی ہدایت کی۔ تین دفعہ وہ جاگا اور سویا اور ہر دفعہ اس نے اُن بزرگ کو یہی فرماتے ہوئے سُنا۔ آخرش اُس نے دہلی جانے کی ٹھان لی اور چند ضروری چیزیں اپنے ساتھ لیکر دوسرے دن دار السلطنت مغلیہ کا رستہ پکڑا۔

تین مہینے راستے کی صعوبتیں اُٹھاکر وہ دہلی پہنچا اور اُس بزرگ کی ہدایت کے موافق ایک مکتب میں بیٹھ گیا جہاں اُس نے تھوڑے ہی عرصے کے اندر اکتساب علوم میں بہت ترقی کی۔ دو برس بعد شاہجہان بادشاہ وقت کے پاس شاہ ایران کی طرف سے ایک تحریر پہنچی جس میں باوجود شاہ ہند ہونے کے شاہ جہان کا لقب اختیار کرنے کی وجہ دریافت کی گئی تھی۔ چونکہ خود بادشاہ کے ذہن میں اس کا کوئی معقول جواب نہیں آیا اس لئے اُس نے تمام اُمرا و علما کو مشورت کے لئے طلب فرمایا لیکن کسی سے اِس کا قابلِ اطمینان جواب نہ بن پڑا۔ مجبور ہوکر بادشاہ نے عام منادی کرادی کہ جو شخص اس کا مناسب جواب دیگا اس کو دربار میں ایک معزز عُہدہ دیا جائیگا۔ اس مکتب کے مولوی صاحب نے بھی جس میں سعد اللہ پڑھتا تھا یہ عقدہ حل کرنے کی کوشش کی مگر بیفائدہ۔ اور پھر اپنے طالبعلموں سے کہا کہ وہ بھی کوشش کریں۔ ہر ایک لڑکے نے اپنی اپنی سمجھ کے موافق ادق اور طویل جوابات لکھے لیکن سعد اللہ نے ایک کاغذ کے پُرزے پر صرف یہ لکھا کہ "ہند" کے

وہی عدد ہیں جو "جہان" کے اس لئے "شاہ ہند" کو "شاہ جہان" کہتے ہیں - اور کاغذ اپنے اُستاد کو دیدیا۔ مولوی صاحب دل میں تو سعد اللہ کی قابلیت اور ذہانت کے قائل ہو گئے لیکن بوجہ رشک کے ظاہر یہ کیا کہ اُس کا جواب بھی کچھ قابل اطمینان نہیں ہے۔ آخر مولوی صاحب نے فیصلہ کیا کہ یہ جوابات بادشاہ کی خدمت میں پیش کئے جاویں - چنانچہ اُن سب کو لیکر وہ دربار میں پہنچے لیکن چالاکی یہ کی کہ سعد اللہ کا جواب سب کاغذوں کے نیچے رکھدیا کہ دو چار جواب پڑھ کر بادشاہ سب کو پھینکدیگا اور ہر ایک کو پڑھنے کی تکلیف گوارا نہیں کریگا۔ لیکن اتفاق سے سعد اللہ کا جواب چونکہ سب کے نیچے تھا بادشاہ کے ہاتھ سے گر پڑا اور اُس نے اُٹھا کر سب سے پہلے وہی پڑھنا شروع کر دیا ع عدو شود سببِ خیر گر خدا خواہد۔ مولوی صاحب نے یہ دیکھ کر کچھ اور کاغذات پیش کرنے چاہے لیکن سعد اللہ کا مختصر سا جواب بادشاہ کے دل کو لگ گیا اور اُس نے سعد اللہ کو اپنے حضور میں طلب کیا۔ وعدہ کے موافق اُس کو ایک بڑا عہدہ دیا گیا لیکن بعض اُمرا کو اس سے حسد ہوا کہ ایک طفل مکتب اسی طرح بازی لے جاوے اور ایک معزز عہدہ پا جاوے۔ چنانچہ اُنہوں نے شاہجہان کے کان بھرنے شروع کئے اور ایک روز موقع پاکر یہ شکایت کی کہ گو سعد اللہ ایک بڑا عہدہ دار ہے مگر اس کو قلم بنانا بھی نہیں آتا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ کل سعد اللہ کو دربار میں قلم بنانے کا حکم دیا جاویگا اور اگر وہ نہ بنا سکا تو موقوف کر دیا جائیگا۔ اتفاق سے سعد اللہ کو بھی اس بات کی کسی نے خبر دی - چنانچہ تمام رات اُس نے قلم بنانے کی مشق کی اور صبح تک ایسا چابک دست ہو گیا کہ صرف تین تراشوں میں وہ نہایت عمدہ قلم بنانے لگا۔ حسب قرارداد سابق دوسرے دن علی الصباح اُس کی دربار میں طلبی ہوئی اور جہاں پناہ نے قلم بنانے کا حکم دیا تو مسعود سعد اللہ اس امتحان میں کامیاب ہو گیا۔ اور دشمنوں کو ندامت اُٹھانی پڑی - اس روز سے اُس کی قابلیت کا سکہ پہلے سے زیادہ بیٹھ گیا۔ بادشاہ کی نظر میں اُس کی اور بھی عزت ہو گئی اور آخرش وہ شاہجہان کا وزیر اعظم

مقرر ہو گیا۔

ایک دن علامی نواب سعد اللہ خاں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ ایک معمر سوداگر ایک بوسیدہ کاغذ ہاتھ میں لئے ہوئے اُس کے سامنے حاضر ہوا اور نہایت ادب سے سلام کر کے وُہ کاغذ پیش کیا۔ ناظرین! یہ وُہی سوداگر تھا جس نے سعد اللہ خاں کے باپ سے اقرار نامہ لکھا کر ایک سیب دیا تھا۔ اور یہ کاغذ وہی اقرار نامہ تھا جس کو پڑھتے ہی وزیر اعظم نے تمام عمّال کے نام ایک فرمان جاری کیا کہ یہ سوداگر ادائیگی محصول سے یک قلم مستثنےٰ کیا گیا اور یہ اُس ایک سیب کا معاوضہ تھا۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ ہم کو اصلی حاجتمندوں کی مدد کرنی چاہئے جس میں بڑے بڑے فائدے ہیں نہ کہ اُن غیر مستحقین کی جو حقداروں کا حق غصب کرتے پھرتے ہیں اور جنہوں نے مانگنا ایک ذریعہ آمدنی سمجھ لیا ہے *

نیاز احمد

ریویو (ڈرامیٹک) بمبئی کی مشہور و معروف وکٹوریہ تھیٹریکل کمپنی کی موجودگی سے لاہور کی رونق میں اندنوں معتدبہ اضافہ ہو گیا ہے اور مہذب تفریح کے شایقین کے لئے دلچسپی کا خاصہ سامان مہیا ہے۔ اسوقت تک اس کمپنی کے صرف دو کھیل ہماری نظر سے گذرے ہیں۔ یعنی ناداں اور گوپی چند لیکن وہ دو کھیل کمپنی کے محاسن کا پتہ لگانے کے لئے کافی ہیں۔ ایک بات تو صاف ظاہر ہے کہ مسٹر بالی (مالک کمپنی) ایکٹنگ کے فن پر بالخصوص توجہ کرتے ہیں۔ اور اُن کے ایکٹروں کو دُوسری کمپنیوں کے ایکٹروں پر ایک خاص فوقیت حاصل ہے جو ذوقِ سلیم پر مخفی نہیں رہتی۔

ناداں میں مصنف نے ترکی اوضاع و اطوار کا نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور بحیثیتِ مجموعی خاصہ دلچسپ ناٹک ہے۔ لیکن اگر بالاستیعاب دیکھا جائے تو پلاٹ میں بعض اس قسم کی خامیاں ہیں۔ جن سے کھیل کی دلچسپی میں بہت کچھ فرق آجاتا ہے۔ گوپی چند ہمارے دوست حضرت طالب کی زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اور قبولیت عامہ کا تاج پہن چکا ہے لوٹن اور جوگن کی چست فقرات زبان زد ہر خاص و عام ہیں۔ اس لئے اس ظرافت پیکر کھیل کی زیادہ توصیف فضول ہے *

اِلتجائے مُسافِر

۲- ستمبر ۱۹۰۵ء ہمارے خاص احباب کی تاریخ محبت میں ایک قابلِ یادگار دن ہے۔ صبح کا سُہانا سماں ہے۔ بمبئی میل دہلی کے ریلوے سٹیشن پر پہنچی ہے **خواجہ سیّد حسن نظامی دہلوی** اور منشی نذر محمد بی۔ اے اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس حلقہ دہلی سٹیشن پر استقبال کو آئے ہیں۔ اِستقبال کس کا ہے؟ جدید شاعری کے رُوح رواں **اقبال** یا اقبال اور اس کے ہمراہیوں کا۔ وُہ کیسے؟ اقبال بغرضِ تکمیلِ علوم و فنون انگلستان کو روانہ ہُوئے ہیں نیرنگ اور آرام اپنے پیارے دوست کو رخصت کرنے کے لئے دہلی تک ساتھ گئے ہیں۔ ریل سے اُتر کر اوّل منشی نذر محمد صاحب کے مکان پر تھوڑی دیر آرام کیا۔ بعد میں سب دوست مل کر حضرت محبوبِ الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا قدّس سرّہ العزیز کی درگاہ آسمان پایگاہ کی طرف روانہ ہُوئے۔ راستے میں شہنشاہ ہمایون کے مقبرے کی زیارت اور سیر کی درگاہ میں پہنچکر مزار مبارک پر حاضر ہُوئے اوّل **اقبال** نے عالم تنہائی میں مزار مُبارک کے سرہانے بیٹھ کر ذیل کی نظم پڑھی اور اُنکی درخواست پر سب احباب باہر صحن میں ٹھہرے رہے۔ بعد میں دوستوں کے اصرار پر اقبال نے اس نظم کو درگاہ کے صحن میں بیٹھکر مزار مُبارک کی طرف منہ کر کے دوبارہ ایک نہایت دردانگیز اور دلنشین لہجے میں پڑھا سب احباب اور دیگر سامعین نہایت متاثر ہُوئے اور بے تحاشا زبان سے موقع بموقع کلماتِ تحسین و آفرین و آمین نکلتے تھے۔ ایک محویت کا عالم تھا کہ جس کی تصویر حاضرین کے تصوّر ہی کھینچ سکتے ہیں۔ درگاہ سے واپس ہوکر خواجہ حسن نظامی صاحب کے مکان پر قیام کیا۔ اور حضرت محبوبِ الٰہی کے لنگر کی مہمانی سے بہرہ اندوز ہُوئے۔ ولائت نامی ایک نوعمر قوال خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر تھا۔ نوتعلیم تھا مگر خوش گلو اور

اور باطبیعت - وہ کچھ گاتا رہا اور وقت نہایت مزے اور کیفیت سے گذرا - اس کے بعد شہر کو واپس ہوئے واپسی کے وقت خاتم الشعرا مرزا اسد اللہ خاں غالب کی تربت پر حاضر ہوئے - عجب کیفیت تھی - بندۂ نیرنگ مرزا صاحب کی تربت کے سرہانے لوحِ تربت پر ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھا تھا میرے دائیں اقبال عالمِ محویت میں بیٹھے تھے اور تربت کے گرداگرد تمام پارٹی حلقہ باندھے ہوئے تھی - دو بجے دن کا وقت اور دن بھی ستمبر کا دھوپ تیز اور ہوا میں گھمس مگر اس قبر کی زیارت کا اثر تھا کہ کسی کو گرمی کا خیال تک نہ تھا - قوال زادے کو عجب وقت کی سوجھی بولا حضور مرزا غالب کی ایک غزل یاد آئی اگر اجازت ہو تو سناؤں - سرد بستاں یاد دہانیدن یہاں عذر کس کو تھا - چنانچہ اس نے یہ غزل گائی :-

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونو کو اک ادا میں رضا مند کر گئی

ذیل کے دو شعروں پر عجب کیفیت رہی -

اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھئے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

غزل کے ختم ہونے پر جب ایک دو منٹ میں ذرا ہوش بجا ہوئے تو سب چلنے کو اٹھے - اقبال نے جوشِ محویت میں مرزا صاحب کی لوحِ مزار کو بوسہ دیا - اور سب شہر کو روانہ ہوگئے -

اچھا پیارے اقبال ؎ بسفر رفتنت مبارک باد - بسلامت روی و باز آئی - زندہ رہینگے تو تین سال بعد تیرے پیارے کلام کو تیری پیاری زبان سے پھر سنیں گے - ناظرینِ مخزن کی ضیافتِ طبع کے لئے یہ نظم اس نوٹ کے ساتھ بھیجتا ہوں - (نیرنگ)

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری فیض عام ہے تیرا

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

ترے وجود سے روشن ہے راہِ منزلِ شوق
دیارِ عشق کا مصحف کلام ہے تیرا

نہاں ہے تیری محبت میں رنگِ محبوبی
بڑی ہے شان بڑا احترام ہے تیرا

ترشحِ مے کدۂ شوق ہے ترے دم سے
طلب ہو خضر کو جس کی وہ جام ہے تیرا

ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم
نظامِ مہر کی صورت نظام ہے تیرا

کرم کرم کہ غریب الدیار ہے اقبال
مریدِ پیرِ نحیف ہے غلام ہے تیرا

اگر سیاہ دلم داغِ لالہ زار تو ام
وگر کشادہ جبینم گلِ بہار تو ام

کیا ہے تیرا مقدر نے مدح خواں مجھ کو
کہے ہزار مبارک مری زباں مجھکو

چڑھا کے پھول مرے رنگِ رفتہ کے سرِ قبر
اڑائے پھرتی ہے حیرت کہاں کہاں مجھ کو

بیاں کروں تپشِ عشق کو تو آتشِ دل
شرارے دے پئے تمہیدِ داستاں مجھ کو

میں تفتہ دل ہوں پرانا نیاز مند ترا
دکھایا آج خدا نے یہ آستاں مجھ کو

مرے سفینے کو تو نے کنارہ بوس کیا
اماں نہ دیتا تھا جب بحرِ بیکراں مجھ کو

چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثلِ نکہتِ گل
ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھ کو

تلاشِ مہر میں شبنم صفت اڑا کہ چمن
ذرا سا دیتا ہے غنچے کا آشیاں مجھ کو

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

نظر ہے ابرِ کرم پر درختِ صحرا ہوں
کیا خدا نے نہ محتاجِ باغباں مجھ کو

فلک نشیں صفتِ مہر ہوں زمانے میں
تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو

مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو

مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو

رہوں میں خادمِ خلقِ خدا جیوں جب تک
نہیں ہے آرزوئے عمرِ جاوداں مجھ کو

دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر
تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھ کو

گریز میرے دلِ دردمند کا ہے شعار
بہت ستاتا ہے اندیشۂ زیاں مجھ کو

بنایا تھا جسے چُن چُن کے خار و خس میں نے
چمن میں پھر نظر آئے وہ آشیاں مجھ کو

پھر آرکھوں قدمِ مادر و پدر پہ جبیں
کیا جنہوں نے محبت کا رازداں مجھ کو

وہ شمع بارگہِ خاندانِ مرتضوی[1]
رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو

نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجھ کو

دُعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

وہ میرا یوسفِ ثانی وہ شمعِ محفلِ عشق
ہوئی ہے جس کی اخوّت قرارِ جاں مجھ کو

جلا کے جس کی محبت نے دفترِ من و تو
ہوائے عیش میں پالا کیا جواں مجھ کو

مرا وہ یار بھی معشوق بھی برادر بھی
کہ جس کے عشق سے جنت ہے یہ جہاں مجھ کو

ریاضِ دہر میں مانندِ گل رہے خنداں
کہ ہے عزیز تر از جاں وہ جانِ جاں مجھ کو

یونہیں بنی رہے محفل مرے احبّا کی
ہرا بھرا نظر آئے یہ بوستاں مجھ کو

بھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا
ملا ہے جس کی بدولت یہ آستاں مجھ کو

قسم ہے اس کے دلِ دردمند کی آقا!
تری ثنا کے لئے حق نے دی زباں مجھ کو

شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

اقبال

[1] مولوی سید میر حسن صاحب قبلہ استادِ اقبال ۱۲

شاعری

تو نے مجھ کو آہ کیوں چھیڑا عروسِ شاعری ۔۔۔ تجھ کو اِک معذور سے اُمید تھی کس بات کی
حافظ و خسرو کی تو ہے صحبتیں پائے ہُوئے ۔۔۔ مصحفی و میر کی آنکھیں ہے تو دیکھے ہُوئے
چاہتی ہے مجھ سے کیا لائی ہے کیا میرے لئے ۔۔۔ ننگ ہے مضمون جعد و ناف کا میرے لئے
شاعری گانا ہے اتنا تو مجھے تسلیم ہے ۔۔۔ یہ تو گانا[1] بھی نہیں ہے ناچ کی تعلیم ہے
چُبھ رہی ہیں میرے دل میں یہ تری گلبازیاں ۔۔۔ کچھ بھلی لگتی نہیں مجھ کو تری یہ شوخیاں
کوئی بانکا کوئی ترچھا حسب مرضی ڈھونڈھ لے ۔۔۔ لکھنؤ سارا پڑا ہے اور کوئی ڈھونڈھ لے
تو مرے قابل نہیں ہے میں ترے قابل نہیں ۔۔۔ تجھ کو جو سامان ہے درکار وہ حاصل نہیں
دن کو اِک گلشن ہے جس میں پھول کچھ کانٹے ہیں کچھ ۔۔۔ رات کو اِک آسماں اِک چاند اور تارے ہیں کچھ
سال پیچھے یا کبھی کالی گھٹا کچھ آگئی ۔۔۔ لیکن اُس سے بھی طبیعت اب مری گھبرا گئی
میز پر کچھ جام کچھ ساغر کوئی پیمانہ ہے ۔۔۔ یہ مرا سامانِ دلچسپی ہے یہ میخانہ ہے
بس یہ پونجی یہ اثاثہ ہے ترے نوشاہ کا ۔۔۔ میرے گھر میں کیا ہے میں ہُوں اور نام اللہ کا
سبزہ و گل کا جو باقی رہگیا ہے اِک لباس ۔۔۔ ماہ و انجم کی جو اِک چادر رہی ہے میرے پاس
کب تک اُس جامہ کو پہناؤں تجھے دھو دھو کے میں ۔۔۔ جس کی نکہت کہتی ہے اُڑ جاؤنگی جُو ہو کے میں
آہ یہ سونے کی تجھ پر آنتیاں اچھی نہیں ۔۔۔ یہ پُرانی تلکڑی[2] کی بجلیاں اچھی نہیں
تیرے گیسو کو بساتا نافۂ مشکِ ختن ۔۔۔ کان میں ہوتا ترے آویزۂ لعلِ یمن
کیا بتاؤں مُلک نے کوئی مدد تیری نہ کی ۔۔۔ اور زمانہ کی کشاکش نے مجھے فرصت نہ دی

---

[1] یعنی تغزل کی عاشقانہ شاعری ۱۲ [2] تلکڑی قسم ساخت ۱۲

میں پہنا دیتا تجھے قدرت کے ہاتھوں کا لباس
یعنی سب پھولوں کا گہنا اور پھولوں کا لباس

پھول وُہ پنجاب کے اور یہ اَودہ کے بھی نہیں
اُن کا رنگ اچھا نہیں اور اُنکی بو اچھی نہیں

چین کے۔ اسپین کی۔ ٹرکی کی۔ اور اٹلی کی پھول
خوشنما۔ خوشرنگ۔ خوشبودار۔ تازی تازی پھول

ہند کی ایک پاک دیوی میں بنا دیتا تجھے
اور گلدیان لندن میں بٹھا دیتا تجھے

* * * * * * * * * * * * * *

شاعروں کو روز اِک دُنیا نئی درکار ہے
شاعری کو آئے دن اِک تازگی درکار ہے

سیکڑوں مُلکوں کی ہو شاعر ہوا کھائی ہوئی
اَور ہو سیر و سیاحت کی سند پائے ہوئی

اُس کا دل کیا ہو بس اِک اچھی نمائشگاہ ہو
جس میں قدرت کی ہر اک ایجاد خاطر خواہ ہو

سیر ہو سامان ہو تفریح ہو گلگشت ہو
بحر بے پایان ہو ساحل ہو جبل ہو دشت ہو

یہ مناظر مجھ کو قدرت کے کوئی حاصل نہیں
اِک قفس میں مُرغ ہے سینہ میں میرے دل نہیں

مانگتا شہباز و شاہیں سے ہُوں شہپر مُستعار
کوئی لا دے آہ مجھ کو تختِ اِندر مستعار

دو گھڑی کر آؤں سیر ساحلِ پُر شورِ نیل
دیکھ آؤں بالٹک کی پُر فضا خاموش جھیل

کھینچ لاؤں کوہِ اَلشبار کی تصویر میں
ہند میں روشن کروں سیلون کی تنویر میں

منتقل کر دوں میں امریکہ سے چاندی کا پہاڑ
مشتعل کر دوں میں اِک ایورسٹ کیا سارا پہاڑ

پاس سے دیکھوں میں جا کر آبشارِ نیاگرا
پونچھ لوں دامن سے چشمِ اشکبارِ نیاگرا

* * * * * * * * * * * * * *

آہ یہ یکسانیت اچھی نہیں اوقات کی
آفرینش اس میں ہو سکتی نہیں جذبات کی

روز اِک گلشن نیا ہو سیر کرنے کے لئے
روز اِک پیکر نئی ہو رنگ بھرنے کے لئے

مجھ کو فرسودہ مضامیں تو پسندیدہ نہیں
غیر کے معشوق پر ہرگز میں گرویدہ نہیں

اَے سخنور تو ہری شیوا بیانی پر نہ جا
تو مرے بحرِ طبیعت کی روانی پر نہ جا

ہو رہا اس بحر میں خاشاک بھی اور گُل بھی ہے / اِس قفس میں زاغ بھی ہو بند اور بُلبل بھی ہو
مَیں نے مانا لوگ کہتے ہیں یہ چشمہ پاک ہے / لیکن اس کی تہ میں جھک کر دیکھ کتنی خاک ہے
جو مرقع کھینچ ڈالے ہیں نے وُہ فرضی ہیں سب / کیسے اصلی؟ آہ نقلی بلکہ دَر نقلی ہیں سب
جانتا ہُوں حسن ہر پیکر کی اصلیت کو میں / تازگی کو ڈھونڈھتا پھرتا ہُوں اور جدّت کو میں
دشتِ غربت کو چلا ہُوں میں وطن کو چھوڑ کر / جا ترا ٹیمس کی گنگا و جمن کو چھوڑ کر
لے چلی جوشش طبیعت بے سر و بے پا مجھے / رل رہیگا کوئی تو اللہ کا پیارا مجھے

نادر علیخاں نآدر (کاکوروی)

بکائے انگلستان

(شیلے اور کیٹس کا مزار)

مَیں نے سونپے تھے جو تجھ کو رُوم کی اور زمیں / کیا کئے تو نے وُہ میرے تاجِ شُہرت کے نگیں
میرے بستانِ سخن کے نو دمیدہ پھول دو / تیرے ویرانے میں ہیں افسوس پیوندِ زمیں
گرد آلودہ جبیں - چہرے ہیں سنولائے ہُوئے / وُہ صباحت ہے نہ وُہ نقش و نگارِ دلنشیں
ذوقِ نظارہ میں لٹریچر کے جو رہتی تھیں وا / آہ! اُن آنکھوں میں اب خوابِ عدم ہے جاگزیں
گوشۂ تاریکِ مرقد میں ہیں اب محوِ سکوت / بولتا تھا جن کا طوطی - وُہ لبِ سحر آفریں
اب نہ وُہ شوقِ تکلّم ہے نہ وُہ ذوقِ سخن / آہ! ان ہونٹوں پہ اب موجِ تبسم بھی نہیں
جس میں قدرت نے بھرا تھا کوٹ کر سوزِ سخن / ہو گیا خاموش آخر ساز وُہ زیرِ زمیں
تیری ظلمت کا گہن ایسا لگا اے خاکِ رُوم / چاند سُورج آہ! میرے چھپ گئے زیرِ زمیں

میرے ساحل سے اگر ہو رُوم کو جانا ترا	تو تجھے میری قسم! اموجِ نسیمِ عنبریں
میری جانب سے سلامِ شوق پہنچانا انہیں	میرے پردیسی جو ہیں شہرِ خموشاں کے مکیں
پھر یہ کہنا خاک اُڑا کر سر پہ اے بادِ صبا!	آفریں! اے میرے تغافل کیش تم کو آفریں

ایسے غربت کو سدھارے پھر وطن کی سُدھ نہ لی

بن میں جا کر میرے پھولوں نے چمن کی سُدھ نہ لی

نازشِ تاجِ سخن تھے میرے دُرِّ شاہوار	پیس ڈالے آہ! تو نے آسیائے روزگار
دشتِ غربت میں کسے کرنیکو پیوندِ زمیں	تو لئے جاتا ہے گھر سے آسمانِ دُون شعار
میرے پھولوں کا ہی گہوارہ کدھر اے خاکِ رُوم	کس حدیقے میں ہے میرے سرو و ریحاں کی بہار
تُو نے گلچینِ اجل چُن چُن کے توڑے میرے پھول	جی کے جی میں آہ! ظالم میرے اب تک ہیں وُہ خار
برقِ خرمن سوز اب کس پر گرائے گا فلک	لہلہا کر جل گئے میرے نہالِ باردار
خانۂ دل میں جگہ دینا مکینوں کو مرے	دیکھنا! پہلو تہی کرنا نہ اے کُنجِ مزار
گدگداتی ہے صبا! کیوں خفتگانِ خاک کو	اِن کی نیندوں کا قیامت تک نہ اُتریگا خمار
سوئے ہیں جس وضع سے شہرِ خموشاں کے مکیں	یوں ہی یہ سوتے رہینگے آہ! تا یوم القرار
تُو شفق کے پھول قبروں پر چڑھاتی ہی جہاں	مجھ کو لے چل! ساتھ اُس مدفن میں اے صبحِ بہار
اپنے پھولوں کی زیارت میں بھی کروں اک نظر	ایک مدت سے ہی حسرت تیری اے طوفِ مزار
وُہ دلاویزی نہیں اگلی سی تجھ میں آہ! رُوم	تیرے ویرانے میں ہیں کچھ نقشِ عبرت یادگار
جس پہ اتراتی ہی اب تک آہ! تیری خاکِ پاک	دفن ہے زیرِ زمیں یہ کون فخرِ روزگار

کس کی تُربت پر "دل دلہا" یہ ہے لکھا ہوا

میرا نقشِ دل نشیں گورِ غریباں! کیا ہوا

تو کہاں ہے آہ! اب اے بلبلِ رنگیں بیاں	چھا رہی ہے تیرے پھولوں کی حدیقے پر خزاں

کُوٹ کر جس میں بھرا تھا جلوۂ حُسنِ ازل — آب و گِل میں تیری تھا وُہ آگ کا شعلہ نہاں
تیرے ذرّوں کی زمیں تھی نازشِ خُلدِ بریں — خوشنما نیلم سے تھا تاروں کا تیرے آسماں
تھا پریخانہ سمندر کا ترے اِک اِک حباب — تیری اِک اِک موج پہ تھا حُورِ جنّت کا گماں
وجد میں تاروں کو لاتا تھا۔ وُہ جادو کا اثر — تیرے مُرغانِ چمن کے زمزموں میں تھا نہاں
بوٹے بوٹے میں تھی تیرے صنعتِ پروردگار — تیرے پتّے میں یہ قُدرت کی تھیں صنّاعیاں
حُسنِ فطرت کا مرقّع تھی وُہ دُنیائے خیال — تھی جہاں محوِ تماشا تیری فکرِ نکتہ داں
نقشِ ہستی آہ! اے شیلے! مٹ گیا تیرا تو کیا — دلنشیں برسوں رہیگا تیرا اندازِ بیاں
آئینگے تیری زیارت کے لئے اہلِ سخن — رُوم میں باقی ہے جب تک تیری تُربت کا نشاں
میرے ہیرو کی ہی پیوندِ زمیں اب آہ! خاک — تیرے ساحل سے نہیں اُٹھتا ہے اب اٹلی وُہ دھواں
بیکسوں پر رحم کر اے دستِ بیدادِ فلک! — خُوں رُلاتی ہے تمنّاؤں کو یادِ رفتگاں
مارتا ہے تیر تو اُس دل پہ صیّادِ اجل! — آگ کے شعلے بھی پہنچاتے نہیں جس کو زیاں

آہ اے دُنیا نہیں ہرگز کسی قابل ہے تو
حسرت و غم جس کا ہے انجام وُہ محفل ہے تو

سُرُور جہان آبادی

سرودِ فنا

جینے ہی جی جہان کے جھگڑے پچاس تھے — اُمّید و بیم حرص و ہوس درد و یاس تھے
زحمت قرین کبھی۔ کبھی رحمت کے پاس تھے — دم تھا تو دامِ دہر کے ہر دم ہراس تھے

خاکی طلسم آج ہر آفت سے پاک ہے
جس خاک سے بنا تھا وہی مشتِ خاک ہے

گرمی سے آفتاب کی خوفِ سقر نہیں   سردی سے سرد آہ کی دردِ جگر نہیں
دنیا کے رنج و غم کا نمایاں اثر نہیں   پہنچے ہیں ایسے گھر میں کہ عزمِ سفر نہیں

اب تابِ حسن ہے نہ حسینوں کی تاک ہے
جس خاک سے بنا تھا وہی مشتِ خاک ہے

کچھ خوف جور کا ہے نہ ظالم کا ڈر ہے آج   افلاس کا خیال نہ درکارِ زر ہے آج
گلبن کی جا ببول کوئی قبر پر ہے آج   اک ڈھیر خاک کا سا سرِ رہگذر ہے آج

جمشید جاہ یا کوئی رشکِ ضحاک ہے
جس خاک سے بنا تھا وہی مشتِ خاک ہے

بجلی گرے ہزار تو ہرگز نہیں ضرر   دریا بہائے ابر برس کر تو کیا خطر؟
دورِ فلک کا جور گیا سر سے سب گذر   دہشت نہ طعن سے ہے نہ تہمت سے کوئی ڈر

فکرِ کفن سے گور کا اب سینہ چاک ہے
جس خاک سے بنا تھا وہی مشتِ خاک ہے

پانی میں آج کوئی بہا دے تو ہیچ ہے   یا جل کے کوئی آگ لگا دے تو ہیچ ہے
اوجِ ہوا پہ دھول اڑا دے تو ہیچ ہے   مٹی میں کوئی مٹی ملا دے تو ہیچ ہے

خالی مکان خاک جو بے جان پاک ہے
جس خاک سے بنا تھا وہی مشتِ خاک ہے

طالب (بنارسی)

ترجمۂ اینک آرڈن

مصنفہ

(لارڈ ٹنی سن مرحوم ملک الشعرائے انگلستان)

اِک سلسلہ ہے پہاڑیوں کا بہتا ہے جس کے نیچے دریا
اُن میں کئی ایک جو درے ہیں کف سے اور ریت سے بھرے ہیں
آگے اِک گھاٹ کی برابر ہیں سامنے لال لال کچھ گھر
ہے بیچ میں اِک پرانا گرجا آثارِ قدیم کا نمونا
اور آگے جو سڑک بنی ہے اُونچی ہوتی چلی گئی ہے
دیکھو جو اُدھر نظر اُٹھا کے گرنی کے بلند ہیں منارے
گرنی کے عقب میں جو سماں ہے قوتِ دل و قوتِ رواں ہے
اُونچا سا وہ مرغزار دلکش سبزہ جس کا زمردیں وش
دکھلاتے ہیں دورِ چرخ کا پھیر ڈنمارکیوں کے جابجا ڈھیر
ہے وہاں جو نشیب خوشنما سا جیسے کشتی میں ہو کٹورا
ہیزل کے اُس میں ہیں گھنے جھنڈ خوانِ یغما ہے جس سے یہ گُنڈ
یعنے کہ بہار جب ہے آتی لڑکوں کو ہے ساتھ گھیر لاتی
خوش خوش سب چنتے ہیں پَیل جنگل میں ہیں مناتے منگل

. . . .

سو سال ہوئے کہ اس جگہ پر ساحل کے کنارے آکے اکثر

کھیلا کرتے تھے تین لڑکے — گو تینوں کے گھر جُدا جُدا تھے
ایک اُن میں حسین آینی لی تھی — تھی رشکِ شباب جس کی طفلی
گو سن تھا بہت صغیر اُس کا — بستی میں نہ تھا نظیر اُس کا
لڑکا اِک دوسرا فلپ تھا — گرنی والے کا تھا جو بیٹا
تھا جان وُہ مادر و پدر کی — اِک شمع یہی تھی اُن کے گھر کی
تھا تیسرا اینک آرڈن نام — ملّاح کا طفل بے سرانجام
طُوفان نے بے پدر کیا تھا — بچپن میں یتیم ہو گیا تھا
تینوں شیر و شکر تھے باہم — دُنیا کا نہ تھا اُنہیں کوئی غم
طفلانہ تھا کاروبار اُن کا — بس کھیل تھا روزگار اُنکا
ساحل کی گری پڑی غنیمت — اُن کے حق میں تھی اِک دولت
انبار کہیں تھے ریسماں کے — ٹکڑے کہیں ڈھیر بادباں کے
بوسیدہ کہیں سے جال اُٹھا لائے — کشتی کوئی پانی سے ہٹا لائے
ریتی کے محل بنا رہے ہیں — کچھ لطف اِسی میں پا رہے ہیں
شورِ امواج دیکھتے ہیں — وُہ گھر تاراج دیکھتے ہیں
ہر روز اِسی طرح ہیں آتے — اور نقشِ قدم ہیں چھوڑ جاتے
لے جاتی ہے لہر جن کو آ کے — تا چشمِ حباب میں جگہ دے

. . . .

ٹیلے کے نیچے ایک ہے غار — مثلِ دلِ تنگ تیرہ و تار
تھے کھیلتے آ کے یاں وُہ اطفال — تھے حال میں اپنے مست و خوشحال
جو جو ہیں امورِ خانہ داری — طے ہوتے تھے یُوں وہ باری باری

ہے صاحبِ خانہ گر فلپ آج — ہوتا اینک کا کل کے دن راج
لیکن بنتی تھی روز اینی — دونو کے ساتھ گھر کی بیوی
ایسا بھی گاہے ماہے ہوتا — اینک کئی روز رہتا تنہا
آتا جو فلپ تو یہ بہ تکرار — کہتا مرا گھر ہے یہ یہ دلدار
دیتا تھا فلپ جواب اُس کو — بیوی میری بھی ہے یہ خوشخو
باہم جھگڑا جو پیش آتا — اینک کہ قوی تھا فتح پاتا
اُس وقت فلپ بہ یاس و حسرت — بھر کر آنکھوں میں اشکِ خجلت
اینک کو بُری بھلی سُناتا — کہتا جو جی میں اُس کے آتا
صُورت یہ دیکھتی جب اینی — ثالث دونوں میں آپ بنتی
سنگت کے لئے ملال کرتی — آنکھیں رو رو کے لال کرتی
کہتی نہ لڑو ہماری خاطر — کڑئی ہے نہ مجھے تمہاری خاطر
باہم تم کو نہ لڑنے دُونگی — بیوی دونوں کی مَیں بنونگی

. . . .

ہر صبحِ بہارِ عہدِ طفلی — صُبحِ کاذب کی تھی سپیدی
گذرے وُہ دن شباب آیا — بالائے سر آفتاب آیا
آئی جو ہوائے باغِ اُلفت — دونوں لگے کھانے داغِ اُلفت
دل میں چُبھے عشق کے جو کانٹے — بُلبل ہوئے دونوں ایک گل کے
موقعہ اینک نے پا کے ناگاہ — اُس کو کیا حالِ دل سے آگاہ
پر لب پہ جو مُہرِ خامشی تھی — اُلفت نہ فلپ کی کھُلنے پائی
اینک ہی کی اینی کو بھی تھی چاہ — گو دل کی لگی سے تھی نہ آگاہ

پر شکل اُدھر کچھ اَور ہی تھی — اینک کے دل کو لو لگی تھی
تھی فکر اُسی کی دھیان اُسی کا — تھا خانۂ دِل مکان اُسی کا
دُھن یہ کہ جو بچ سکے بچائے — کشتی ایک اُس سے مول لائے
جب آمدنی کے ہوں کچھ آثار — اینی کے لئے بنائے گھر دار
تھا نیک خیال اُس کا جیسا — آخر ہوا بامراد ایسا
ماہی گیروں میں منزلوں تک — آتا تھا نظر نہ مثل اینک
تھا ایک ہی وُہ میانِ ساحل — خوشحال جفاکش اور پُردل
اِک سال وُہ اُس کے بھی علاوہ — ملّاح کا کام کر چکا تھا
جس سے خُوب اُس کو ہو گئی تھی — مشقِ فنِ جہاز رانی
طوفان میں بھی تین بار اس نے — پائی تھی نجات اجل کے مُنہ سے
اب چلنے لگا تھا کام اُس کا — مشہور تھا سب میں نام اُس کا
طے ہو چکی اس طرح پہ شکل — اکیسویں عمر کی جو منزل
ذاتی کشتی خرید لایا — چلتے ہوئے کام کو بڑھایا
گرنی کی سڑک پہ گھر بنایا — چھوٹا خوش وضع صاف سُتھرا
مقصد کا حصُول دل میں ٹھانا — اینی کے لئے کیا ٹھکانا

. . . . . .

آخر آیا وُہ نیک ہنگام — اور موسمِ گل کی جانفزا شام
اُس گانوں کے طفل اور جوان جب — تعطیل منانے آئے تھے سب
جھولی لئے کوئی کوئی ڈالی — پھل چُنتے تھے پھر کے ڈالی ڈالی
لیکن تھا فلپ کا باپ بیمار — ساتھ آ نہ سکا وہ سب کے ناچار

آنے میں جو ہو گئی ذرا دیر — قسمت نے دکھایا اور ہی پھیر
آیا دِل میں بھرے ہوئے ذوق — ٹیلے پر چڑھ گیا بصد شوق
نزدیک نشیب کے جو پہنچا — جھاڑی ہے گھنی جہاں۔ تو دیکھا
اِینک اور اِینی دست در دست — بیٹھے ہیں شراب عشق سے مست
اِینک کا رُخ تعب کشیدہ — سرد و گرمِ زمانہ دیدہ
اور اُس کی وہ چشم ہائے میگوں — اندازہ نمائے دشت و ہاموں
اِک جانِ بہار دل کشِ عشق — اِک شعلہ فروشِ آتشِ عشق
اُن کے چہروں پہ جو لکھا تھا — اس کی قسمت کا فیصلہ تھا
دونوں کو لب بہ لب جو دیکھا — سینے سے اِک دُھواں سا اُٹھا
آہستہ سے بسملوں کے مانند — دِل باختہ بیدلوں کے مانند
جھاڑی میں اُتر گیا وُہ غمگیں — جی کھول کے زار نالیاں کیں
خوشیاں سب اُدھر منا رہی تھے — حرماں جان اُس کی کھا رہی تھے
آخر اُٹھا چلا بمشکل — گھر کی لی راہ داغ بر دل

.....

اللہ نے پھر یہ دِن دکھایا — اِینک کا مُدعا بر آیا
گرجا میں خوشی خوشی جرس نے — شادی کے بجائے شادیانے
دِن کٹنے لگے مہنی خوشی سے — کِس لُطف سے سات سال گذرے
آپس کا خلوص اور محبّت — محنت کی کمائی اور قناعت
مسعود یہ عہد ہفت سالہ — یُوں صحت و عیش میں گذارا
اولاد بھی حق نے کی کرامت — دُختر ہوئی پہلے اِک عنایت

بیٹی کی صدائے گریہ جس دم | آئی گوشِ پدر میں پیہم
سوچا انجامِ کارِ مولود | پیدا ہوا یہ خیالِ محمود
جو ہو سکے جس طرح بچائے | تعلیم اچھی اُسے دلائے
ماں باپ میں جو کسر ہے باقی | اولاد میں وہ کمی ہو پوری
پورے کئے شمس کے جو دو دور | قوت ہوئی اس خیال کو اور
یعنے اینک تھا جب سفر میں | آغوشِ محیطِ پُرخطر میں
یا یہ کہ رواں میانِ بر تھا | راہ خشکی میں رہ سپر تھا
ازبسکہ وہ نقرہ رنگ ہو آ | اور رہ آوردِ بحرِ زخار
اُس کا وہ لال لال چہرہ | محنت سے سفر کی جوشش تھا
اینک جو ہر جگہ گذر تھا | پہچانا ہوا تھا ہر بشر کا
بازار ہی تک وہ تھا نہ آتا | تھا۔ دامنِ کوہ میں بھی جاتا
ایک ایک گلی تھی اس کی چھانی | ایک ایک ڈیوڑھی تھی اُس کی جانی
ہوتی تھی رسائی اسکی واں پر | ڈیوڑھی وہ قدیم ہے جہاں پر
طاؤس کا دربہ معرکہ ہے | ببر ایک طرف بنا ہوا ہے
اس کی ہر جمعہ کی غنیمت[1] | واں ہوتی تھی زیبِ خوانِ نعمت
اس حال میں آئی جب تھی تنہا | بیٹا خالق نے اُس کو بخشا
لعلِ شب تاب ہاتھ آیا | تنہائی کا غمگسار پایا

ضامن کنتوری

[1] مچھلیاں مراد ہیں ۱۲

آؤ ہم بتلائیں کہ پچیس ہزار مریض کس طرح صحت یاب ہوتے ہیں

ممیرہ — مقوی بصر۔ محافظ بینائی۔ دافع نزول الماء۔ دھند۔ غبار۔ آب روانی وغیرہ۔ قیمت فی تولہ دو روپے (عہ)۔

حب ذیابطیس — پیشاب کا بار بار آنا اور شکر دور کر کے تندرستی نصیب ہو۔ فی تولہ عہ

حب قبض کشا — ایک گولی سے دائمی قبض دور اور تمام عوارض درد سر۔ یرقان وغیرہ کافور۔ ۳ درجن (عہ)

جوہر عشبہ — صفائی خون کے لئے بے مثل۔ گندے خون کو زہر سے صاف کرتا ہو۔ دانے پھوڑا پھنسی۔ ناسور۔ بھگندر خارش۔ شیشی کلاں (عہ) شیشی خورد (عہ)

[illegible] — چند منٹ میں آرام۔ ۴ تولہ ایک روپیہ (عہ)

حب دافع وجع المفاصل — درد اعضا۔ جوڑوں کا درد دور ہو۔ ۲ ہفتہ کے لئے دو روپے (عہ)۔

حب دافع [illegible] — تلی یا لف کے دفعیہ کے لئے شرطیہ ۲ ہفتے کے لئے دو روپے (عہ)

اکسیر بال — دلربا خوشبو کے علاوہ بال بے وقت سفید نہیں ہونے دیتا۔ نزلہ۔ زکام کو دور کرتا ہے ضعف دماغ کو مفید۔ فی شیشی (عہ)۔

[illegible] — اس کے لگانے سے بال بکثرت پیدا ہوتے ہیں قیمت فی شیشی دو روپے (عہ)

دوائی خارش — سالوں کی خارش اور بدن کے دانے دو دن میں خشک ہو جاتے ہیں۔ ۲ تولہ (عہ)

[illegible] — اخراج بلغم۔ درد سینہ۔ سرفہ کہنہ اور خراش گلو نزلہ کا چھاتی پر گرنا اس کے استعمال سے بند ہو جاتا ہے اور ہر موسم میں کارآمد۔ ایک تولہ کی قیمت (عہ)

حب قائم مقام افیون — چنڈو۔ افیون بلاتکلف اس سے چھوٹ جاتے ہیں۔ ایک تولہ۔ ایک روپیہ (عہ)

مرہم عجیب — برسوں کا زخم بھر جاتا ہے۔ بھگندر و ناسور کے لئے اکسیر اور عجیب الاثر ۲ تولہ (عہ)۔

دوائی درد کان — دو قطرے ڈالنے سے آرام ہو جاتا ہے ایک شیشی دو سو مریضوں کو کافی ہے۔ قیمت عہ

جوارش مقوی معدہ — خوش مزہ۔ بھوک لگاتا اور کھانا ہضم کرتا ہے۔ ۴ تولہ ایک روپیہ (عہ)

سنون مستحکم دندان — ہلتے دانت مضبوط اور میل دور کرتا ہے۔ قیمت (عہ)۔

ید اللہ دافع بخار — دو رتی بھر سے بخار اتر جاتا ہے اور پسینہ خوب آتا ہے۔ قیمت ۲ درجن عہ

ضیق النفس یا دمہ — سانس رکنا اور بلغم وغیرہ دور ہو کر صحت ہو جاتی ہے (عہ)

رعنا — چہرہ کے داغ بدنما وغیرہ دور ہو جاتے ہیں۔ ۴ تولہ عہ۔

مفتت حصات — درد گردہ دور اور ریگ مثانہ بے تکلف خارج ہو جاتی ہے ۴ تولہ (عہ)

اکسیر شفا — دوائی طاعون بطور علاج حفظ ماتقدم حامل مرض کے حملہ سے محفوظ رہتا ہو۔ غربا کو مفت فی شیشی عہ

حکیم ڈاکٹر غلام نبی زبدۃ الحکما ایڈیٹر رسالہ حافظ صحت لاہور موچی دروازہ

خاندان حکیماں لاہور کے سینہ بسینہ مجرب نسخے

محصولڈاک (کحل بے نظیر یعنی سرمۂ بے نظیر) فی تولہ قیمت عہ

اگر کسی صاحب کو نزول الماء۔ دھند۔ غبار۔ ککرے۔ ضعف بصارت وغیرہ کی شکایت ہو۔ یا آنکھ کے متعلق کسی قسم کی اذیت ہو تو ہمارا سرمہ منگائیں انشاءاللہ تعالےٰ کل نقص رفع ہوگا۔ قیمت فی تولہ عہ ویسے عہ نمونہ مفت جو صاحب نمونہ منگوانا چاہیں۔ تو محصولڈاک وغیرہ کے واسطے ۱؎ کے ٹکٹ ارسال فرمادیں۔

شہادتیں۔ ۲۔ اگست سنہ ۱۹۰۴ء } مشفق مکرمی جناب سید حکیم نادر علیشاہ صاحب السلام علیکم مزاج شریف۔ آپکے مشہور کحل بے نظیر کا میں نے خود بھی امتحان کیا۔ اور احباب سے بھی اسکی بابت رائے پوچھی۔ میں بلا ریب کہتا ہوں کہ یہ سرمہ اسم بامسمےٰ ہے۔ دھند غبار۔ سرخی چشم کے رفع کرنے میں فوری اثر رکھتا ہے۔ حکمت اگرچہ آپکا وراثۃً حصہ ہے لیکن اس خاص شوق اور دلچسپی کے باعث جو آپکو قدرتاً اس فن میں ہے مجھے امید واثق ہے کہ آپ دن دونی رات چوگنی ترقی کرینگے والسلام۔

آپکا مخلص فقیر سید سعید الدین رجسٹرار عدالت خفیفہ لاہور (حال منصف پٹھان کوٹ)

کرم فرمائے بندہ جناب حکیم صاحب دام الطافکم :۔

بعد سلام سنت الاسلام واضح رائے شریف ہو۔ آپکے کحل منظر کا میں نے استعمال کیا اور اسکو واقعی بےنظیر پایا۔ مجھکو عرصہ سے ضعف بصر اور غبار و دھند کی شکایت تھی اور آنکھوں میں پانی بھرا رہتا تھا بہت سے مختلف اشتہاری سرموں کا استعمال کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ البتہ آپکے سرمہ سے آنکھوں کو بہت فائدہ پہنچا یا اسمیں خاص خوبی یہ ہے کہ روز اول کے استعمال سے ہی آنکھیں صاف غبار اور پانی خشک ہو جاتا ہے۔ آنکھوں میں قوت بینائی زیادہ ہونے لگتی ہے اسلئے خواہ مخواہ دل چاہتا ہے کہ ہر روز بلا ناغہ استعمال کیا جاوے اشتہاری دوا کے خریدنے سے جو مایوسی ہی دل میں ہوا کرتی ہے۔ وہ اسکے اول روز کے ہی استعمال سے دور ہو جاتی ہے اور قیمت ادا کردہ کا افسوس نہیں ہوتا اس سرمہ کے روز اول ہی کے استعمال سے مجھے اسقدر فائدہ ہوا ہے۔ جو دوسرے سرموں کے چالیس دن تک کے استعمال سے نہیں ہوا ہے

رقیمہ نیاز عبد العزیز کلرک دفتر پوسٹماسٹر جنرل صاحب بہادر پنجاب و نارتھ ویسٹ فرانٹیر مراسلہ ۳۱۔ اگست سنہ ۱۹۰۴ء

پتہ۔ حکیم سید نادر علی شاہ۔ بازار حکیماں لاہور پنجاب

ممیرے کا سرمہ

پانچ ہزار روپیہ انعام

مصدقہ جناب اسسٹنٹ کیمیکل اگزامنر صاحب بہادر گورنمنٹ پنجاب

معزز انگریزوں میڈیکل کالج کے پروفیسر نامور ڈاکٹروں والیان ریاست و ولایت کی یونیورسٹی کے سند یافتہ یوروپین ڈاکٹروں نے بعد تجربہ اس سرمہ کی تصدیق فرمائی ہے کہ یہ سرمہ امراض ذیل کیلئے اکسیر ہے ضعف بصارت تاریکی چشم۔ دھند۔ جالا۔ پڑوال۔ غبار۔ ڈھلکا۔ سرخی۔ پھولا۔ ابتدائی موتیا۔ ناخنہ۔ پانی بہنا۔ خارش وغیرہ معزز ڈاکٹر اور حکیم بجائے اور دوائیوں کے آنکھ کے مریضوں پر اب اس سرمہ کا استعمال کرتے ہیں چند روز کے استعمال سے بینائی بہت بڑھ جاتی ہے اور عینک کے استعمال کرنیکی حاجت نہیں رہتی بچے سے لیکر بوڑھے تک کو یہ سرمہ یکساں مفید ہے قیمت اسلئے کم رکھی ہے کہ عام خاص اس سرمہ سے فائدہ اٹھا سکیں قیمت فی تولہ جو سال بھر کیلئے کافی ہے مبلغ عہ دو روپیہ ممیرے کا سرمہ سفید اعلیٰ قسم فی تولہ مبلغ سے تین روپیہ۔ خالص ممیرہ فی ماشہ عشہ مصری سرمہ فی تولہ عہ خرچ ڈاک ذمہ خریدار۔

المشتہر پروفیسر میا سنگھ اہلووالیہ مقام بٹالہ ضلع گورداسپور

ان سے بڑھکر اور کیا معتبر شہادت ہو سکتی ہے

(۱) میں نے ممیرے کا سرمہ سردار میا سنگھ اہلووالیہ نے تیار کیا ہے ان مریضوں پر کہ جنکی آنکھیں بہت کمزور اور بیمار تھیں استعمال کر کے دیکھا مفید پایا میری رائے میں خاص کر ان مریضوں کے واسطے جن کی آنکھوں سے پانی جاری رہتا ہے۔ اور دھند۔ غبار کمزوری نظر ہو یہ سرمہ نہایت ہی مفید ہے۔

راقم

ڈاکٹر موہن لال گھوش انیباد ایل۔ ایم۔ ایس اسسٹنٹ سرجن پروفیسر میڈیکل کالج لاہور و آنریری سرجن گورنر جنرل ہند

(۲) میں اس امر کی بڑی خوشی سے تصدیق کرتا ہوں کہ میں نے ممیرے کا سرمہ جو کہ سردار میا سنگھ اہلووالیہ نے تیار کیا ہے اپنے زیر علاج کئی ایک قسم کے مریضوں پر استعمال کیا۔ میری رائے میں بینائی قائم رکھنے اور آنکھوں کی بیماریوں سے بچنے کے لئے ممیرے کے سرمہ کا استعمال بہت مفید ہے

راقم

خان بہادر ڈاکٹر سید امیر شاہ ایل ایم ایس اسسٹنٹ سرجن پروفیسر میڈیکل کالج لاہور۔

پانچ ہزار روپیہ انعام

اگر کوئی شخص ممیرے کے سرمہ کی سندات میں سے جو کہ قریب بیس ہزار کے ہیں ایک کو بھی فرضی ثابت کردے اسکو مبلغ پانچ ہزار روپیہ انعام دیا جائیگا۔ جو لاہور کے پنجاب نیشنل بینک میں اسی مطلب کے لئے مارچ سنہ ۱۹۰۱ء سے جمع کیا گیا ہے۔

وکیل اور زمیندار کا قصہ

کسی گاؤں میں ایک سادہ لوح غریب زمیندار برنارڈ نامی رہا کرتا تھا ایکدن اسکو شہر جانیکا اتفاق ہوا جہاں وہ ایک مشہور وکیل سے ملا اور پوچھا کہ امیر بننے کی کوئی راہ بتلادیں۔ وکیل نے اپنی فیس لیکر ایک بند لفافہ برنارڈ کے حوالہ کیا۔ گھر میں آکر شام کے وقت زمیندار نے لفافہ کھولا۔ تو لکھا تھا۔

جو کام آج کر سکتے ہو اسکو کل پر مت ڈالو۔

زمیندار کا ہزاروں من چارہ باہر کھیت میں پڑا تھا۔ فوراً اسکو گھر لاکر مکان کے اندر رکھوا دیا۔ رات کو طوفان آیا اور بارش موسلا دھار ہوئی جن لوگوں کا چارہ باہر تھا۔ سب بہ گیا اگلے دن سارے گاؤں میں صرف برنارڈ ہی بشاش تھا طاعون کا طوفان بارش کے طوفان سے بدرجہا خوفناک ہے جو لوگ برنارڈ کی طرح خوش خرم و بیفکر رہنا چاہتے ہوں۔ انکو طاعون کی دوا ہر وقت گھر میں رکھنی چاہئے۔ ہمنے کبھی نہیں سنا۔ کہ کسی مریض نے ہماری دوا کا استعمال کیا ہو اور وہ راضی نہوا ہو۔ یا کسی تندرست آدمی نے اسکا تھوڑا استعمال کیا ہو اور وہ طاعون کا شکار ہوا ہو۔

۱۔ دوائی طاعون ہزاروں جانیں بچا چکی ہے۔ قیمت دو روپے فی شیشی۔

۲۔ خضاب مثل تیل چلیل کے لگایا جاتا ہے۔ سفید بالوں کو سیاہ بھونرا کر کے اصلی رنگت دیتا ہے بالوں کو ریشم جیسے نرم رکھتا ہے۔ جلد پر داغ نہیں دیتا۔ قیمت دو روپے (عہ)

۳۔ روغنی گولیاں۔ انکے استعمال سے بال ہمیشہ سیاہ رہتے ہیں اگر سفید ہوگئے ہوں تو بھی آہستہ آہستہ سیاہ ہوجاتے ہیں (عگ)

۴۔ گلگونہ۔ چہرہ کے چھائیاں۔ سیاہ داغ وکیل دور کر دیتا ہے خوبصورتی کیواسطے لازمی ہے قیمت (عہ)

۵۔ دوائی بواسیر۔ بواسیر خونی ہو یا بادی مسّے اگر ہوں تو بلا تکلیف گم۔ شرطیہ شفا قیمت (عگا)

۶۔ روح النساء عورتوں کی سب بیماریوں کے واسطے اکسیر ہے قیمت (عگے)

۷۔ روغن کان بہرے ہوں بہتے ہوں درد سائیں سائیں ہر طرح کی آوازیں آتی ہوں فوراً آرام ہوتا ہے قیمت (عگا)

۸۔ سرمہ ممیرہ۔ دھند۔ غبار۔ لالی۔ پڑوال۔ پانی۔ جالا۔ ناخنہ وغیرہ کیواسطے اکسیر موتیا کے واسطے سفیدہ امریکہ و جرمنی تک مشہور (عگا)

۹۔ بال اڑانیکا تیل بلا تکلیف خارش دو منٹ میں بال دور ہوں قیمت ۸ر فی شیشی (محصول ڈاک بذمہ خریدار)

ملنے کا پتہ:۔ ڈاکٹر کیسر سنگھ ایم اے بکرم ہسپتال فیروزپور شہر (پنجاب)

پانچ ہزار روپیہ انعام

ممیرے کا سرمہ

پانچ ہزار روپیہ انعام

مصدقہ جناب اسسٹنٹ کیمیکل اگزامینر صاحب بہادر گورنمنٹ پنجاب

سرخہ انگریزوں میڈیکل کالج کے پروفیسروں نامور ڈاکٹروں والیان ریاست اور معالجات کی یونیورسٹی کے سند یافتہ یورپین ڈاکٹروں نے بعد تجربہ اس سرمہ کی تصدیق فرمائی ہے کہ یہ سرمہ امراض ذیل کے لئے اکسیر ہے ضعف بصارت تاریکی چشم - دھند - جالا - پڑوال - غبار - پھولا - سرخی - پھٹا - ابتدائی موتیا - ناخنہ - پانی بہنا - خارش وغیرہ - بلکہ ڈاکٹر اور حکیم بجائے اور ادویہ کے آنکھ کے مریضوں پر اب اس سرمہ کا استعمال کرتے ہیں - چند روز کے استعمال سے بینائی بہت بڑھ جاتی ہے اور عینک کے استعمال کرنے کی حاجت نہیں رہتی - بچے سے لیکر بوڑھے تک کو یہ سرمہ یکساں مفید ہے قیمت اس لئے کم رکھی ہے کہ عام و خاص اس سرمہ سے فائدہ اٹھا سکیں - قیمت فی تولہ جو سال بھر کے لئے کافی ہے مبلغ دو روپیہ (عہ) - ممیرے کا سرمہ سفید اعلیٰ قسم فی تولہ مبلغ (عسہ) تین روپیہ ہے - خاص ممیرہ فی ماشہ عسہ - مصری سرمہ فی تولہ ۸ خرچ ڈاک بذمہ خریدار

المشتہر پروفیسر میاں سنگھ اہلووالیہ مقام بٹالہ ضلع گورداسپور

ان سے بڑھ کر اور کیا معتبر شہادت ہو سکتی ہے

(۱) میں نے ممیرے کا سرمہ جو سردار میاں سنگھ اہلووالیہ نے تیار کیا ہے ان مریضوں پر کہ جنکی آنکھیں بہت کمزور اور بیمار تھیں استعمال کر کے دیکھا مفید پایا - میری رائے میں خاصکر ان مریضوں کے واسطے جن کی آنکھوں سے پانی جاری رہتا ہو - اور دھند - غبار - کمزوری نظر ہو یہ سرمہ نہایت ہی مفید ہے

راقم

ڈاکٹر برج لال گھوس رائے بہادر ایل ایم - ایس اسسٹنٹ سرجن و پروفیسر میڈیکل کالج لاہور و آنریری سرجن گورنر جنرل ہند

(۲) میں اس امر کی بڑی خوشی سے تصدیق کرتا ہوں کہ میں نے ممیرے کا سرمہ جو کہ سردار میاں سنگھ اہلووالیہ نے تیار کیا ہے اپنے زیر علاج کئی ایک قسم کے مریضوں پر استعمال کیا - میری رائے میں بینائی قائم رکھنے اور آنکھوں کی بیماریوں سے بچنے کے لئے ممیرے کے سرمہ کا استعمال بہت مفید ہے -

راقم

خان بہادر ڈاکٹر سید امیر شاہ ایل - ایم - ایس اسسٹنٹ سرجن و پروفیسر میڈیکل کالج لاہور

پانچ ہزار روپیہ انعام

اگر کوئی شخص ممیرے کے سرمہ کی اسناد میں سے جو کہ قریب بیس ہزار کے ہیں ایک کو بھی فرضی ثابت کر دے اسکو مبلغ پانچ ہزار روپیہ انعام دیا جاوے گا - جو لاہور کے پنجاب بینک میں اسی مطلب کے لئے مارچ ۱۹۰۸ء سے جمع کیا گیا ہے -

فصیح الملک

یہ اسم بامسمّی رسالہ سنہ ۱۹۰۰ء سے شائع ہوتا ہے جسمیں خصوصیت کے ساتھ اُردو علم ادب اور شاعری کی خدمت ہوتی ہے۔ یہ رسالہ حضرت داغ دہلوی مرحوم کی یادگار میں شائع ہوتا ہے۔ قیمت سالانہ دو روپیہ۔ پتہ:- لاہور رنگ محل احسن مارہروی اڈیٹر

دیوان غالب (اردو)

عمدہ کاغذ پر خوش خط چھپا ہوا

صحیح

یعنی اصلی دیوان کے مطابق جسکا پروف خود مرزا غالب کی نظر سے گذرا تھا

مع

شرح دیوان غالب (قابل دید)

بہ مضامین دلچسپ نازک۔ زبان نہایت فصیح و عبارت مختصر و سلیس

از سید فضل الحسن حسرت موہانی۔ بی اے

تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۶ جزو قیمت مع محصول ڈاک و خرچ وی پی

صرف عہ

درخواست خریداری بنام منیجر رسالہ اردوئے معلّٰی علی گڈھ آنا چاہیے

فہرست مضامین

(۱) دیباچہ از صفحہ ۱ تا صفحہ ۲ (۳) دیوان مع شرح از صفحہ ۱ تا ۲۲۰

(۲) مقدمہ { (۱) غالب کے حالات از ۳ ; (۲) غالب کی شاعری ۲۲ } (۴) ضمیمہ یعنی وہ غزلیں و اشعار جو مطبوعہ دیوان میں موجود نہیں ص ۲۲۴

آئینۂ داغ

اردو ہے جسکا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اسمیں نہ صرف زمانہ حال کے ہر دلعزیز و مقبول عام شاعر اور زبان اُردو کے سب سے بڑے محسن و مربی کے جزو و کل حالات اور معرکۃ الآرا اشعار آپکو ملینگے۔ بلکہ ہر حصہ ملک کے تمام داغ کا پورا مرقع آنکھوں کے سامنے آجائیگا۔ داغ مغفور کے چبھتے اور پھڑکتے ہوئے اشعار کے ساتھ دہلی کے مشاہیر شعرا مثل ذوق۔ غالب۔ مومن وغیرہ کا کلام بھی مختلف طبائع و اصناف سخن کا رنگ دکھانے کے لیے درج ہے۔ غدر سے پہلے قلعہ معلّٰے کے مشاعرہ میں حضرت داغ کی شرکت۔ ہز ہائینس نواب رامپور کی قدردانی۔ کلکتہ کا سفر۔ حیدرآباد دکن کا قیام۔ حضور نظام کی قدر افزائی غرض مرحوم کی زندگی کے ہر مرحلہ کی مفصل کیفیت نہایت دلچسپ پیرایہ میں قلمبند کیگئی ہے۔ یہ سوانح عمری جناب داغ مرحوم کے دوست اور معاصر جناب میر نثار علی صاحب شہرت دہلوی کی مرتب فرمائی ہے۔ نہایت خوشخط مضبوط کاغذ پر مع تصاویر کے جو عالی فوٹو سے لیگئی ہیں طبع ہوئی ہے۔ قیمت صرف ۱۲ ار

المشتہر محمد سراج الدین مالک و مہتمم مفید کتب ایجنسی رنگ محل لاہور

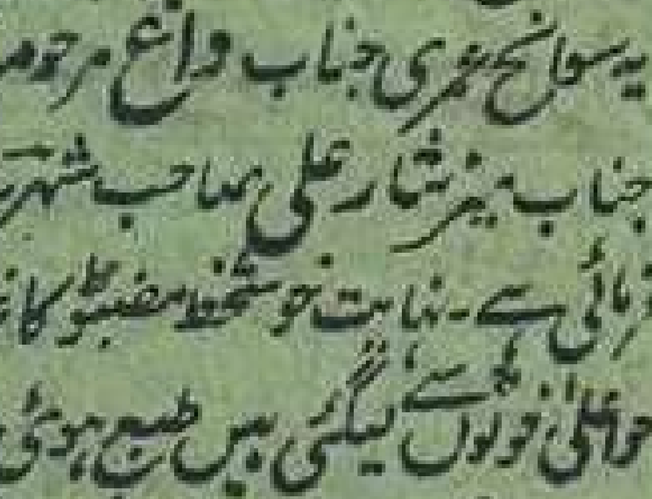

ترکی ٹوپیاں

ہم نے اپنے احباب کیلئے نہایت اعلیٰ قسم کی عمدہ اور نفیس ترکی ٹوپیاں جنکے پہننے کا ترکی میں رواج ہے منگائی ہیں جو مخمل کیطرح نہایت ملائم اور خوشنما ہیں

اپیل بھی ہوئی ہیں قیمت درجہ اول فی ٹوپی عہ درجہ دوم فی ٹوپی عہ سوم فی ٹوپی عہ چہارم فی ٹوپی عہ

المشتہر محمد سراج الدین مہتمم مفید کتب ایجنسی لاہور

وکیل اور زمیندار کا قصہ

کسی گاؤں میں ایک سادہ لوح وغریب زمیندار برنارڈ نامی رہا کرتا تھا۔ ایک دن اس کو شہر جانیکا اتفاق ہوا جہاں وہ ایک مشہور وکیل سے ملا اور پوچھا کہ مالدار بننے کی کوئی راہ بتلا دیں۔ وکیل نے اپنی فیس لے کر ایک بند لفافہ برنارڈ کے حوالہ کیا۔ گھر میں آکر شام کے وقت زمیندار نے لفافہ کھولا۔ تو لکھا تھا:-

جو کام آج کر سکتے ہو اس کو کل پر مت ڈالو

زمیندار کا ہزاروں من چارہ باہر کھیت میں پڑا تھا۔ فوراً اس کو گھر لاکر مکان کے اندر رکھوا دیا۔ رات کو طوفان آیا اور بارش موسلا دھار ہوئی۔ جن لوگوں کا چارہ باہر تھا۔ سب بہ گیا۔ اگلے دن سارے گاؤں میں صرف برنارڈ ہی بشاش تھا۔ طاعون کا طوفان بارش کے طوفان سے بدرجہا خوفناک ہے۔ جو لوگ برنارڈ کی طرح خوش خرم و بے فکر رہنا چاہتے ہوں۔ ان کو طاعون کی دوا ہر وقت گھر میں رکھنی چاہئے۔ ہم نے کبھی نہیں سنا کہ کسی مریض نے ہماری دوا کا استعمال کیا ہو اور وہ راضی نہ ہوا ہو۔ یا کسی تندرست آدمی نے اسکا تھوڑا تھوڑا استعمال کیا ہو اور وہ طاعون کا شکار ہوا ہو۔

۱۔ دوائی طاعون ہزاروں جانیں بچا چکی ہے۔ قیمت دو روپے فی شیشی

۲۔ خضاب۔ مثل تیل ہمیں کے لگایا جاتا ہے۔ سفید بالوں کو سیاہ بھنور کر کے اصلی رنگت دیتا ہے۔ بالوں کو ریشم جیسے نرم رکھتا ہے۔ جلد پر داغ نہیں دیتا۔ قیمت دو روپے (عا)

۳۔ روغن وگولیاں۔ ان کے استعمال سے بال ہمیشہ سیاہ رہتے ہیں۔ اگر سفید ہوگئے ہوں تو بھی آہستہ آہستہ سیاہ ہو جاتے ہیں (عا)

۴۔ گلگونہ چہرے سے چھریاں۔ چھائیاں سیاہ داغ وکیل دور کر دیتا ہے۔ خوبصورتی کیواسطے لازمی ہے قیمت (عا)

۵۔ دوائی بواسیر۔ بواسیر خونی ہو یا بادی۔ مسے اگر ہوں تو بلا تکلیف گم۔ شرطیہ شفا قیمت (عا)

۶۔ روح النساء۔ عورتوں کی سب بیماریوں کے واسطے اکسیر ہے۔ قیمت (عہ)

۷۔ روغن کان بہرے ہوں بہتے ہوں۔ درد سائیں سائیں یا طرح طرح کی آوازیں آتی ہوں فوراً آرام ہوتا ہے قیمت (عا)

۸۔ سرمہ ممیرہ۔ دھند۔ غبار۔ لالی۔ پڑوال۔ پانی۔ جالا۔ ناخنہ وغیرہ کے واسطے اکسیر۔ موتیا کے واسطے مفید امریکہ و جرمنی تک مشہور (عا)

۹۔ بال اڑانیکا تیل۔ بلا تکلیف و خارش دو منٹ میں بال دور ہوں قیمت ۸ فی شیشی (محصولڈاک بذمہ خریدار)

ملنے کا پتہ:- ڈاکٹر کیسر سنگھ ایم۔ اے بکرم ہسپتال فیروزپور شہر (پنجاب)

ہر فن مولا

ہر قسم کے ہنر و دستکاریاں سکھانیوالی کتاب ۔ بیکاروں کو روزگار

ایسا جامع و کارآمد مجموعہ آج تک کسی زبان میں نہیں چھپا

فہرست مضامین دیکھیے

باب ا گلٹ سازی ۔ گھڑی سازی ۔ فوٹوگرافی ۔ تار برقی ۔ نقشہ کشی ۔

باب ۲ ۔ صابن ۔ ربڑ کی مُہر ۔ کافوری ۔ کھانڈ کے کھلونے ۔ موم کے پھول ۔ ریشم کا گلدستہ ۔ بادام کا حلوا ۔ ابرک کا گلاس وغیرہ بنانا

باب ۳ ۔ گوٹا ۔ کلابتو ۔ سوزنی ۔ کارچوبی ۔ ایمبرائیڈری چکن ۔ سوئی کا کام ۔ کشیدہ وغیرہ کاڑھنا ۔ موزے و گلوبند وغیرہ بننا ۔

باب ۴ ۔ رنگریز ۔ عطار ۔ خوانچہ ۔ کھنڈسار ۔ کانچ کا کام وغیرہ بنانا ۔

باب ۵ چھاپہ کا کام ۔ برف خانہ ۔ ڈبل روٹی ۔ سوڈا واٹر ۔ شیشہ کا کام وغیرہ ۔

اتنا مضمون ایک کتاب میں اس طرح سمایا کہ تحریر گنجان باریک ۔ عبارت مختصر ۔ صرف مطلب کی بات ۔ تھوڑے الفاظ میں سمجھا دی ۔ جتنی بھید دل کی پول کھول دی ۔

جتنی اس کی قیمت ہوا تنے میں کوئی ایک ترکیب بھی نہ بتلا دیگا ۔ ایسی کتاب اس روپیہ کو بھی سستی ۔ مضمون کے دام ہیں کاغذ کا شمار مت کرو ۔ اشتہار کے موافق نہو تو دام واپس دین گے ۔

قیمت عام سے سو روپیہ مگر غریبوں و طالب علموں کو ایک روپیہ

پاکٹ سائیکلوپیڈیا

دنیا بھر کی معلومات اور ہر قسم کے علمیت کا خزانہ ہر وقت جیب میں رکھو

اس میں ہر محکمے کی تمام ضروری باتیں جن سے اکثر کام پڑتا رہتا ہے یا ذہن کی ضرورت ہے ایک جگہ سب جمع ہیں

(۱) سب ملکوں کے نقشے و جغرافیہ
(۲) ہر شہر کی مشہور دستکاریاں و پیداوار
(۳) دیسی ریاستوں کی آبادی و آمدنی وغیرہ
(۴) اردو ہندی کے تمام شاعروں کے حالات
(۵) دنیا بھر کے مشہور آدمیوں کے پتے
(۶) تواریخی معلومات قابل یادداشت
(۷) بنگلہ ۔ گورمکھی ۔ گجراتی ۔ عبرانی وغیرہ کے حروف کی پہچان
(۸) انگریزی الفاظ اصطلاحی ہر قسم کی تشریح
(۹) قانون کی ضروری باتیں خرچ عدالت وغیرہ
(۱۰) اوزان پیمانے و سکے غیر ملکوں کے
(۱۱) جنتری سود تنخواہ وغیرہ کی
(۱۲) چنگی کا محصول ۔ ڈاک تار وغیرہ کے قواعد
(۱۳) محکمہ ریل کے ضابطے اور تمام ریلوں کے نقشے
(۱۴) پھل پھول ترکاریاں دیسی ولایتی کا بیان
(۱۵) ہدایات حفظ ۔ حادثات کا علاج
(۱۶) ادویات کی شناخت و تاثیر ۔ غذا مفید و مضر
(۱۷) جنگلی بوٹیوں کے نشان و خواص وغیرہ
(۱۸) امراض کے نام ڈاکٹری ویدک یونانی
(۱۹) شگون قیافہ و موسمی پیشنگوئی کے اصول
(۲۰) حساب و پیمائش گز ۔ سفری فیتہ
(۲۱) اصطلاحات کیمیا ۔ جواہرات کا بیان
(۲۲) ہندوستان بھر کے اخبارات ۔ انجمن ۔ میلے وغیرہ

وغیرہ صدہا باتیں بمفصل کہاں تک لکھیں ۔ اکیلی کتاب میں پچاس کتابوں کے برابر مضمون ۔ سوداگر ۔ وکیل ۔ زمیندار حکیم طالبعلم سب کے مطلب کی ۔ کارباری آدمی کے لیے نعمت ۔ تھوڑے خرچ اور وقت میں پوری واقفیت ۔

ملنے کا پتہ } **ودیا ساگر ڈپو علیگڈھ**

دو سو روپیہ ماہوار کی آسامی

حکیم محمد شریف صاحب آئی ڈاکٹر لاہور مقدمہ کتاب "سرمایہ نشاط" کی پیروی کے لئے ولایت تشریف لیجاتے ہیں۔ اُنکو اپنے کارخانجات کے مینجمنٹ کے لئے اشتہاری دنیا سے ماہر تجربہ کار۔ بی۔ اے پاس مینجر کی ضرورت ہی۔ تنخواہ دو سو روپیہ ماہوار دینگے +

درخواستیں حکیم صاحب کے نام بھیجنی چاہئیں۔

آپ بہت کچھ کما سکتے ہین

ہم کو تمام انڈیا کے ہر ایک شہر اور قصبہ میں ایجنٹوں کی ضرورت ہی۔ تنخواہ دار اور کمیشن پہ کام کرنے والے سردست

دو ہزار ایجنٹ

رکھے جاوینگے۔ ہیڈ ایجنٹوں کے سوائے۔ اسٹیشن ماسٹر۔ پوسٹ ماسٹر۔ سکول ماسٹر پٹواری۔ عرضی نویس۔ ضلعدار۔ قانون گوئے۔ کلرک وغیرہ کمیشن ایجنٹ مقرر ہو سکتے ہیں۔ کمیشن معقول دیجاویگی۔

تمام درخواستیں **حکیم محمد شریف آئی ڈاکٹر۔ لاہور** کے نام آنی چاہئیں۔

ممیرہ اور سچے موتیوں کا سفید سُرمہ

مصدقہ جناب نامی گرامی ڈاکٹر ڈبلیو آر رائیس صاحب بہادر۔ ایف
سی۔ ایس۔ اے۔ آر۔ ایس۔ ایم۔ فیلو آف کمسٹری لنڈن

جس کی نسبت لندن وکلکتہ وپنجاب آگرہ میڈیکل کالج کے سند یافتہ معزز ڈاکٹروں نوابوں راجاؤں کے معزز حکیموں وصاحبان جج بہادر ومجسٹریٹ بہادر وصاحبان ڈپٹی کلکٹران بہادر ومعزز یورپین صاحبان انگریز بہادر وغیرہ نے بعد تجربہ و استعمال کے ہم کو یہ لکھا ہے کہ آپکا ممیرہ و سچے موتیوں کا سفید سرمہ آنکھوں کی بیماریوں و ترقی روشنی کے واسطے بہت مفید اور سب سے بہتر دوا ہے کہ جس کے سارٹیفکیٹ بوقت فرمائش آپ کی خدمت میں ہم خود بھیجدینگے۔ ملک وکس وغیرہ کے معزز ڈاکٹران وحکیم آنکھوں کی بیماریوں میں اور دواؤں کو چھوڑ کر ہماری اس دوا کو استعمال کرتے ہیں۔ ہم نے اصلی وعمدہ ممیرہ بڑی تلاش سے ہندوستان کے باہر سے منگایا ہے۔

ہمارے سرمہ کا امتحان اور اس میں جلد کامیابی

ہمگاہ ناپ کر ہمارا سرمہ لگایئے و دیکھئے میں روشنی آنکھ کی بہت بڑھ جائے گی اور آنکھ کے جملہ نقص دور ہو جائینگے (۲) عینک کی ضرورت نہیں (۳) دھند۔ ڈھلکہ۔ آنسو بہنا۔ سردی۔ سوزش۔ کھجلی۔ آنکھ کے سامنے کا اندھیرا پلکوں کے اندر کے دانے و سُرخی۔ گوہانجی (۱۳) لکھنے پڑھنے سے آنکھوں کا تھکنا۔ درد بہت جلد شرطیہ رفع کرتا ہے (۴) کمزور نگاہ سے سوئی میں تاگا بہت جلد چھوڑ لیجئے۔ پڑوال۔ بل جالا۔ پھولی۔ ابتدائی موتیابند۔ ناخنہ۔ ککرے (۲۲) آنکھوں میں سرخ ڈورے پڑجانے کو (۲۳) پلکیں گرجانے والی بیماری کو مفید ہے۔ کمزور آنکھ کو قوت دیتا ہے۔ آنکھوں کے میل اور مواد صاف کرتا ہے اور جوامراض سے محفوظ رکھتا ہے قیمت فی تولہ (ستے) روپیہ

المشتہر :۔ رام سرن نگم۔ کانپور۔ (اپنا نام ومقام ونام ڈاکخانہ وضلع خوشخط لکھو ورنہ تعمیل نہ ہوگی)

چند معزز اور قابل قدر ولائق اطمینان شہادتیں

(۱) عالیجناب ڈاکٹر ای۔ وائی روڈ صاحب بہادر آر ڈی۔ ایم۔ پی۔ لنڈن۔

(۲) جناب ڈاکٹر ایچ۔ پی۔ بنرجی صاحب۔ ایل۔ ایم۔ ایس و سرجن کلکتہ۔

(۳) جناب ڈاکٹر پی۔ این بنرجی صاحب ایل۔ ایم۔ ایس اسسٹنٹ سرجن میرٹھ۔

(۴) جناب ڈاکٹر الہ یار خاں صاحب آ۔ ایس۔ جی۔ سی اسپیشل اسسٹنٹ ضلع بجنور۔

(۵) جناب ڈاکٹر عبد الحفیظ صاحب اسسٹنٹ سرجن ضلع بجنور۔

(۶) عالیجناب شمس العلماء خان بہادر جناب مولوی محمد ذکاء اللہ صاحب پروفیسر سابق میور کالج الہ آباد۔

(۷) جناب مولوی شیخ امین احمد صاحب ڈپٹی کلکٹر بہادر اسسٹنٹ مہتمم بندوبست کانپور۔

(۸) میر حمزہ حسین صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ایل سب جج بہادر مقام منگھیر

(۹) عالیجناب مولوی سید صاحب منصف درجہ اول ضلع ہمیر پور۔

(۱۰) عالیجناب منشی جگت نرائن صاحب ڈپٹی کلکٹر بہادر ضلع بستی

(۱۱) عالیجناب مسٹر جی رہی صاحب کرجی۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ایل۔ ایسشن جج بہادر گونڈا۔

(۱۲) عالیجناب مسٹر ماد صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ایل جج خفیفہ بہادر مقام منگھیر

(۱۳) عالیجناب مسٹر شنکر لال صاحب ایکسٹرا جج بہادر مقام منگھیر

(۱۴) عالیجناب مسٹر جی ڈاربی صاحب بہادر ڈسٹرکٹ و ایڈوکیٹ سپرنٹنڈنٹ کانپور

(۱۵) عالیجناب جی بانگ صاحب بہادر انجینئر ریلوے۔